امانت

(مضامین، خاکے، انشائیے، رپورتاژ، نثرپارے اور متفرق تحریریں)



حالات نے جن کو بھی کیا ہے نظر انداز
ہر سمت سے آتی ہے اُن ہی لوگوں کی آواز



فاطمہ تاج

تاریخ و سن اشاعت: ۲۵ر مارچ ۱۹۹۳ء
تعدادِ اشاعت: ایک ہزار
قیمت: ۴۰/- روپے
طباعت: اعجاز پریس۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد
طباعت سرورق: انتخاب پریس، جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد ۱
ناشر: فاطمہ تاج
پتہ: ۳۳۹-۳-۲۲، مگر باؤلی۔ میر چوک۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲
کتاب ملنے کے پتے: ۔ حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ پتھر گٹی۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲
۔ مصنفہ، ۳۳۹-۳-۲۲، مگر باؤلی۔ میر چوک۔ حیدرآباد ۲

اِنتساب

"امانت ہے"

فاطمہ تاج

ترتیب و تزئین



"لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم"

میں نے زندگی کی بہت سی ادھوری باتوں کو اس کتاب میں مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دامِ زندگی بڑا ہی پُرفریب ہے۔ ہم اس کی قید میں رہ کر کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے، نہ جانے کب در کھُل جائے اور ہم اُس "صبح و شام" کی سرحد پر پہنچ جائیں جہاں ایک روشن لکیر فنا اور بقا کو تقسیم کرتی ہے یا پھر کوئی واردات ہمیں آگے قدم بڑھانے سے روک دے یا پھر کوئی حادثہ ہمیں جنون کی منزل تک لے جائے ...... بہتر ہے کہ ہم اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس تاریخی حصّے کا باب بن جائیں جہاں زندگی کے مختلف عکس نمایاں ہیں مسلسل نظر انداز کئے جانے والے لوگ دنیا کی اہم ترین شخصیتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کے بعد ان ہی لوگوں کی کھوج کی جاتی ہے جن کے وجود سے دنیا بے خبر رہتی ہے، زندگی کے تجربے امانت ہیں، ضروری ہے کہ انہیں دوسروں تک پہنچایا جائے میں نے اپنا بار کم کرنے کے لئے "امانت" کی اشاعت ضروری سمجھی، یہ وہ تسلی ہے جو میں نے خود اپنے آپ کو دی ہے حالانکہ تسلی دوسروں کو دی جاتی ہے، خود کو نہیں۔

گھر کے روایتی ماحول نے ہمیشہ میری کم علمی پر طنز تو کیا لیکن کبھی یہ مشورہ نہیں دیا کہ میں بھی کوئی سرکاری امتحان دے لوں، کوئی ڈگری حاصل

کرلوں، چودہ سو سال پہلے کا طریقہ زندگی اب بھی ہمارے گھر میں رائج ہے۔

میرے والد خالص حجازی تھے لیکن وہ میری شعرگوئی سے بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ چھوٹی سی عمر میں ننھی منی غزلیں لکھ لیتی جو آداب شاعری سے واقف نہ ہونے کی وجہ بے وزنی کا شکار رہتیں۔ میرے والد نے اس سلسلے میں سید احسان علی عرشی (مرحوم) کو بہ حیثیت استاد مقرر کیا تھا۔

موسم آتے جاتے رہے، گردشِ دوراں بدستور نشیب و فراز میں لاتی لے جاتی رہی۔ زندگی کے ساتھ بہت دور تک اجنبی کی طرح چلتے چلتے خیال آیا کہ اپنے دل کے اندر چھپی خواہشوں کو پورا کرلینا ہی بہتر ہے۔ اب یہ صبح و شام زیادہ وفا کرتے نظر نہیں آتے، تو بس، میں نے اپنے اس قلمی سفر کا آغاز کردیا تیس سال بعد میں پھر اس مقام پر آگئی جہاں شوقِ ادب کی چنگاریاں شعلہ بننے کو بے قرار تھیں، بے شمار غزلیں جمع ہو چکی تھیں، ایک سہیلی کے توسط سے ممتاز شاعر امیر احمد خسرو صاحب تک پہنچی۔ کلام دیکھ کر انہیں بہت حیرانی ہوئی، پھر بھی تقریباً چودہ غزلیں درست کردیں جو کچھ بے وزنی کا شکار ہو گئی تھیں جن میں سے صرف چار غزلیں پہلے مجموعہ کلام "اب کے برس" میں شامل ہیں، باقی تمام غزلیں ابتدائی دور کی تھیں، اس لئے میں نے انہیں ناقابلِ اشاعت سمجھ کر چھوڑ دیا۔

جناب احسان علی عرشی کی دیکھی ہوئی تمام غزلیں بھی، جو مشق کے زمانے کی تھیں، میں نے مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ پھر محترمہ تابش سلطانہ صاحبہ نے بھی اپنا بھرپور تعاون مجھے دیا۔ جب شعری مجموعہ کی اشاعت کا شوق ہوا تو فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ کے مشورے پر نامور شاعر صلاح الدین نیّر تک میرا کلام پہنچا۔ فردوساً مشورہ سخن کرتی

رہی، اور نوک پلک سنور گئی، پھر مجموعۂ کلام "اب کے برس" شائع ہو گیا۔

زندگی میں سب سے بڑی خوشی "اپنی کتاب" ہوتی ہے باقی تمام خوشیاں عام ہیں۔ بہر حال احسان علی عرشیؔ سے صلاح الدین نیرؔ تک میں شعر و ادب کے جن دشوار راستوں سے گذر کر نثر کی منزل تک پہنچی ہوں اس کا بھی ذکر کرتی چلوں، شاعرہ اور مضمون نگار کی حیثیت سے محترم محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے "سیاست اخبار" کے ذریعہ میرا تعارف کروایا جن کی میں بے حد شکر گذار ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ محترمہ سلطانہ شرف الدین، محترمہ فاطمہ عالم علی خاں اور محترمہ نایاب سلطانہ نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی، "آس پاس" کے انتساب سے ساری کہانی سمجھ میں آتی ہے تا . . . . . !

نظم و نثر کی ترتیب و تزئین کے تمام مرحلوں پر نیرؔ بھائی کے مخلصانہ تعاون کو بھلا نہ سکوں گی۔ میری تینوں کتابیں "اب کے برس" "آس پاس" اور "امانت" راست نیرؔ بھائی کی زیر نگرانی شائع ہوئی ہیں۔

اپنی کتابوں کے ابتدائی صفحات کی زینت بڑھانے والی معزز ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں، جن کے نام یہ ہیں: محترم سید ہاشم علی اختر صاحب، محترم محبوب حسین جگر صاحب، پروفیسر مغنی تبسم صاحب، محترم ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب، محترمہ سلطانہ شرف الدین، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، محترمہ فاطمہ عالم علی خاں، محترمہ صالحہ الطاف، ڈاکٹر اختر سلطانہ، اور ان سب کے علاوہ وہ معزز مقررین جو میری کتابوں کی رسم اجرا کے موقع پر اپنی قیمتی رائے، اظہارِ خیال اور قیمتی وقت سے بھی مجھے سرفراز کرتے رہے، ان کے نام بھی شاملِ تحریر کرنا شکریہ کے طور پر

ضروری سمجھتی ہوں ان کے نام یہ ہیں محترمہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ، محترمہ قادری بیگم سابق پرنسپل ویمنس کالج ، محترمہ پروفیسر شریف النساء ، محترمہ بیگم ہاشم علی اختر ، محترمہ انیس ڈاکٹر حسن الدین احمد ، محترمہ ڈاکٹر آمنہ حیدر خان ، محترمہ آر بانو صاحبہ ، محترمہ ڈاکٹر ناصرہ خانم ، محترمہ ڈاکٹر اشرف رفیع ، محترمہ ڈاکٹر اختر سلطانہ ، محترمہ ڈاکٹر صابرہ سعید ، محترمہ انیس قیوم فیاض ، محترمہ قمر جمالی ، محترمہ ڈاکٹر اقبال جہاں قدیر ، محترمہ رفیعہ سلطانہ شاہین اور احمدی خاتون نصیب ۔

منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے والی شاعرات محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید ، محترمہ نایاب سلطانہ ، محترمہ آر بانو صاحبہ ، محترمہ مظفر النساء ناز اور محترمہ اقبال جہاں قدیر ۔

○

* ہم غم کا بوجھ جتنا ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی یہ بوجھ بڑھتا جاتا ہے معلوم نہیں کیوں ....؟

○

سید ہاشم علی اختر
سابق وائس چانسلر عثمانیہ و علی گڈھ یونیورسٹی

پیش لفظ

میں فاطمہ تاج سے شخصی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن کوئی دو سال ہوئے حیدر آباد کے ادبی اُفق پر ایک مشکل سے نظر آنے والا ہلال فاطمہ تاج کی شخصیت میں نمودار ہوا اور اس مختصر سی مدت میں ایک شاعری کا مجموعہ "اب کے برس" (۱۹۹۲ء) اور ایک افسانوں کا مجموعہ "آس پاس" (۱۹۹۳ء) اور بہت سے مقالے مضامین خاکے اور انشائیے شائع ہوتے رہے اور اب اللہ کا یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ یعنی ہلالِ ادب ، بدر کامل بننے کی مسلسل کوشش میں ہے۔

ان کی پچھلی دو کتابوں پر حیدر آباد کی ادبی دنیا کی کئی شخصیتوں نے رائے دی ہے جن میں محبوب حسین جگر پروفیسر مغنی تبسم ، ڈاکٹر حسن الدین احمد ، سلطانہ شرف الدین ، بانو طاہرہ سعید ، فاطمہ عالم علی خان ، صالحہ الطاف اور ڈاکٹر اختر سلطانہ جیسی شخصیتیں شامل ہیں۔ جن سے فاطمہ تاج کی جاذب نظر شخصیت ، ذہانت ، کام کی لگن اور خوش اخلاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حیدر آبادی تعلیم یافتہ خواتین کی ایک باوقار انجمن "محفل خواتین" میں جس میں حیدر آباد کی اکثر سینئر ادیب اور شاعر خواتین شامل ہیں۔ فاطمہ تاج نے بہت ہی کم عرصے میں ہر دل عزیزی حاصل کرلی ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہوں گی ، جنھوں نے اتنے قلیل عرصہ میں سماجی اور ادبی دنیا میں ایک واضح مقام حاصل کرلیا ہے لیکن صاف گوئی سے لکھے ہوئے خود اپنے تعارف "پریانگ دہل" کو پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اسکول اور کالج کی باقاعدہ تعلیم نہ ہونے ، قدامت پرست گھرانے میں پیدا ہونے اور کسی قدر کم قدامت پرست سسرال کے ماحول کے باوجود جبکہ کوئی اور کمتر قوت ارادی خاتون قدامت کے سمندر میں گوہر شاہوار ہونے کے باوجود اپنی ساری خوبیوں سمیت تہہ میں مٹ جاتی۔ فاطمہ تاج نے اُس شیشے کی دیوار پر جو تازہ ہوا کو آنے سے روکتی تھی اپنا لبریز گلاس دے مارا اور اُس خوشبودار نرم ہوا میں بھیگنے لگیں جو برسوں شیشے کی دیوار کے پیچھے رُکی ہوئی اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

ذہین اور حساس شخصیت میں جو شعریت بھری ہوئی تھی اور خیالوں میں جو افسانے بنتے اور بگڑتے رہتے تھے وہ شعروں ، افسانوں اور مضامین کی شکل میں اس تازہ ہوا کی زد میں آکر پھیلنے لگی۔ بہت سے خواب ضبطِ تحریر میں آئے۔ بہت سے شخصی تجربے ، افسانوں کی شکل میں لکھے جانے کے باوجود پڑھنے والے کو سرگوشی میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ افسانہ نہیں ہے لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مطابق کہ افسانہ افسانہ ہونا چاہیے۔ اکثر افسانے اُس معیار پر پورے اُترتے ہیں کہیں کہیں سوچ مائل ہم کے افسانوں کا ایک پہلو کہ ایک جانے پہچانے مزاج کا کردار زندگی کی کسی ایک موڑ پر ایک بالکل نیا رُخ اختیار کرلیتا

ہے حسین کا ان کے عام ایمیج سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی افسانے میں شیکسپیر کے اس قول کی تصویر ملتی ہے کہ دوزخ کی کوئی شدت کسی شکستہ دل عورت کے غصہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کہیں اپنے ملک کے توہم پسند ماحول پر طنز ہے اور کہیں ان حسرتوں، تلخیوں اور جھلستوں کا ذکر ہے جو شاید ہر ایک کے دل میں ہوتی ہیں لیکن اُن کے ظاہر کرنے کی ہمت یا صلاحیت نہیں ہوتی۔
بہر حال ان کے اکثر افسانے اچھے ہیں اور بقول ڈاکٹر حسن الدین احمد

"اُن کے کردار بے جان نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں اور فاطمہ تاج نے نہ صرف سنگِ راہ کو ٹھوکر ولں سے ہٹایا ہے بلکہ انہیں بہت دور پھینک دیا ہے۔"

ان کے شعری مجموعے "اب کے برس" کے بارے میں دوسرے تبصروں کے ساتھ جن میں کلام کی تعریف کی گئی ہے، میں بھی شامل ہوں۔ آج کل اُردو کے دور ادبار میں بیسیوں شعری مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ اگر پچاس سال بعد کسی شاعر کے چند اشعار بھی اُردو کی محفلوں میں یاد رکھے جائیں تو اُسے خوش قسمت سمجھا جا سکے گا۔ اس لئے کہ کم از کم ہندوستان میں اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے کمی آ رہی ہے، گو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

مجھے محبوب حسین جگر کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "فاطمہ تاج اُردو کی ایک صاحب طرز ادیبہ بن جائیں گی"۔ اس لئے کہ اُردو والوں کے موجودہ سماج میں ایسے لکھنے والوں کی کمی ہے جو اس سماج کے مسائل اُس کی کمزوریوں اور ان کے حل کے لئے ایک حساس دل، ایک غور و فکر کرنے والا دماغ اور ایک متاثر کن طرزِ تحریر رکھتے ہوں۔

میری دعا ہے کہ مضامین، خاکوں اور انشائیوں کا یہ مجموعہ اُن کی ادبی شخصیت میں مزید ترقی کی جانب ایک اور قدم ثابت ہو۔

--

صالحہ الطاف

اپنے ہی قبیلے کی ایک قلمکار۔ فاطمہ تاج

حیدرآباد کے تقریباً ہر تعلیم یافتہ گھرانے میں اخبار سیاست شوق سے پڑھا جاتا ہے، شائد یہ اس لئے کہ اس اخبار میں قارئین کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو بڑے سے بڑے نیشنل اخبارات میں بھی شائد نہ ہو۔ اس اخبار سے مجھے اور میرے افراد خاندان کو دیرینہ لگاؤ ہے۔ میرے حقیقی چچا ممتاز صحافی حبیب اللہ اوج، حیدرآباد کے مشہور اخبارات میزان، آواز، رہبر دکن کے ایڈیٹر تھے (جو ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے) وہ بھی سیاست کے معیار کے معترف ہیں۔

سیاست کے ادبی اڈیشن میں بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ مجھے اُردو شعر و ادب سے اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی دلچسپی ہے۔ یوں تو سیاست کا کالمس کے ذریعے حیدرآباد کی قدیم و جدید اہلِ قلم خواتین سے تعارف ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب مجھے فاطمہ تاج کی تحریریں پڑھنے کو ملیں تو میری دلچسپی میں کچھ اور اضافہ ہوتا گیا۔ فاطمہ تاج نے محفلِ خواتین کی شام غزل کے رپورتاژ (جو سیاست میں شائع ہو چکی ہے) سے اپنی شناخت بنانی شروع کی۔ پھر اس کے بعد محفلِ خواتین سے وابستہ بہت سی اہلِ قلم خواتین کے خاکے چھپتے رہے۔ فاطمہ کی تحریریں کچھ اس قدر پُرکشش تھیں کہ مجھے ان کی تحریروں کی اشاعت کا انتظار رہتا۔

تصورات کی دنیا بھی کتنی پیاری ہوتی ہے۔ خیالات ہوا کے جھونکے کی سی پھرتی سے نکل جاتے ہیں ۔ واقعات جو گذر گئے ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے۔ گو یہ آنکھوں سے اوجھل ضرور ہیں، لیکن میں کبھی انہیں بھولنا نہیں چاہتی ۔ میں نے انہیں اپنے تصور میں محفوظ رکھا ہے۔ مجھے اپنے خیالستان میں سیر کرنا اچھا لگتا ہے۔ ماضی کے دھندلکوں میں اُن کی گھنیری چھاؤں میں مجھے سکون ملتا ہے ۔ آج انھیں گذرے ہوئے ایک مدت ہوئی ۔ مگر مجھے ایسے لگتا ہے۔ جیسے وہ کل ہی کی تو بات ہو ۔ اُس آنگن کی سوندھی مٹی کی خوشبو آج بھی میں محسوس کرتی ہوں ۔ جن در و دیوار کی آغوش میں میں نے اپنا بچپن اور بعد کی زندگی گذاری اَب وہ فاطمہ تاج کی ملکیت ہے۔ تقریباً ۱۸، ۱۹ سال کا عرصہ ہو رہا ہے ۔ ایک قبول صورت، کچھ شوخی اور شرارت لئے ہوئے اور ایک چھوٹی سی گول مٹول بچی کو اپنے گود میں لئے ہوئے! مجھ سے ملیں یہ تھی فاطمہ تاج۔ بس یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اِن کا یہ عکس میرے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ کیونکہ تاج کا تعلق آج اُس در و دیوار اُس آنگن سے ہے جس میں میں نے اپنا بچپن اور بعد کی زندگی گذاری ۔ پرانے شہر کے ایک قدیم محلہ مگر باؤلی (میر چوک) میں جو میرا آبائی مکان تھا۔ گڑیوں کی زندگی سے لے کر کتابوں کی دنیا تک پھر عملی زندگی کا آغاز اُسی مکان کے زیرِ سایہ ہوا ۔ اُسی مکان کے سائبان میں، میں نے اپنے بہت ہی اچھے اور ناقابلِ فراموش دن گذارے۔ اُسی مکان میں میرے دادا، میرے ابّا، امّی میرے بھائی بہنیں اور خاندان کے دیگر افراد نہایت سکون کے دن گذارے ۔

آج جب میں یہ لکھنے بیٹھی ہوں تو آسمان پر ستاروں کے قندیلیں روشن ہیں، میں اپنے آپ کو فاطمہ کے آنگن میں محسوس کر رہی ہوں ۔ مجھے موتیا، چنبیلی

اور گلاب کی وہ کلیاں یاد آ رہی ہیں، جن کا کام صرف مسکرانا ہے۔ ہوائیں اُنھیں گدگدا رہی ہیں۔ بعض چپ ہیں، اور کچھ تبسم ریز کوئی شوخی سے سرمست، کوئی سرگوشی کرتی ہوئی پنکھڑیوں سے شبنم کے قطرے ڈھلک جائے۔ آنگن میں بیٹھ کر مجھے کلیوں کے چٹکنے کی آواز سننا اچھا لگتا تھا، پتوں کی سرسراہٹ مجھے نغمے بکھیرتا محسوس ہوتی۔ انگور کی بیلوں پر کوئل کی آواز جس میں ڈوب جانے کو جی چاہتا، سنائی دیتی۔ جس طرح جگنوؤں کی روشنی اندھیرے کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ گو یہ تمام چیزیں میری آنکھوں سے اوجھل ضرور ہیں، لیکن میرے لاشعور میں محفوظ ہیں۔ جب بھی فاطمہ سے گفتگو کرتی ہوں تو انھیں خوش اور شگفتہ پاتی ہوں، اُن کے بعض فقرے دل کو چھو جاتے ہیں۔ اِن میں ادبی شعور بھی ہے، شوخی اور شرارت بھی، اِن میں زندگی بسر کرنے کا حوصلہ ہے۔ فاطمہ تاج سے شخصی ملاقات کم فون پر زیادہ گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ فاطمہ تاج کے لب و لہجہ میں وہی رس وہی مٹھاس اور وہی خوشبو پاتی ہوں، جو مجھے میری بہنوں کی گفتگو میں ملتی ہے۔ تاج کے پیچھے خلوص اور طبیعت کی بے ساختگی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ملنساری، خوش مزاجی اور شائستگی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ میں جب کبھی فاطمہ سے ملتی ہوں یا فون پر گفتگو کرتی ہوں تو تازہ دم ہو جاتی ہوں۔

مجھے تاج کی شاعری پہلی دفعہ سیاست کی معرفت ہی پڑھنے کو ملی لیکن جب اُن کی شاعری کا مجموعہ "اب کے برس" مجھ تک پہنچا تو میں نے بڑی توجہ کے ساتھ پڑھا۔ وہ ایک باصلاحیت شاعرہ ہیں۔ اُن کی شاعری میں سچے جذبات، شیریں و تلخ تجربات، مشاہدات اور قلبی واردات کی ایک ختم نہ ہونے والی کیفیات ملتی ہیں۔

سیدھے سادے اور موزوں لفظوں نے اُن کی پُر معنی شاعری کو اور موثر بنا دیا ہے۔ فاطمہ کی شاعری زیادہ تر داخلی واردات سے معمور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بھی قارئین و سامعین کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔

"اب کے برس" کی اشاعت کے کچھ ہی مہینے بعد تاج کے افسانوں کا مجموعہ "آس پاس" کی رسمِ اجراء تقریب نہایت اچھے پیمانے پر منعقد کی گئی تھی۔ آس پاس کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ فاطمہ کے تمام کے تمام افسانے سچے واقعات کے آئینہ دار ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاطمہ تاج نے اپنے ذاتی اور آس پاس کے واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔

"امانت" فاطمہ تاج کی ایک ایسی تازہ تصنیف ہے جس میں مضامین، خاکے، انشائیے، نثر پارے، رپورتاژ اور متفرق تحریریں شامل ہیں۔ فاطمہ کے قلم کی روانی ہے، اسٹائل منفرد ہے۔ طرزِ تحریر چونکا دینے والا ہے۔ بے ساختہ تحریروں کا یہ مجموعہ "امانت" اُردو ادب میں ایک موزوں مقام پانے کا مستحق ہے۔ جب اُردو ادب کی تاریخ ازسرِنو لکھی جائے گی تو فاطمہ تاج کا نام بھی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی فہرست میں مناسب مقام پر ملے گا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ فاطمہ تاج کی برجستگی نہ صرف شاعری میں پائی جاتی ہے بلکہ نثر میں بھی بے ساختہ پن ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ زود گوئی نے ان کی شاعری اور تحریروں کو یوں ہی کاغذ پر بکھیر دیا ہے۔ تقریباً ہر شعر اپنی بھرپور شعریت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

میں اکثر سوچتی ہوں حیدرآباد میں کیسے کیسے فنکار بستے ہیں۔ ایسے لوگ جن کی معاشرہ میں اچھی خاصی پذیرائی ہوتی ہو، اگر وہ باصلاحیت دانشوروں، فنکاروں

ہنرمندوں اور قلمکاروں کی مناسب انداز میں سرپرستی و حوصلہ افزائی کرتے رہیں تو ہمارے شہر کے باصلاحیت لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا منفرد مقام بنالیں گے یہ بات میں اس لئے بھی کہہ رہی ہوں کہ حیدرآباد کے بیشمار صاحبانِ فکر و فن مناسب تعلیم و تربیت اور مناسب سرپرستی و حوصلہ افزائی کی وجہ سے بلند سے بلند مقام پر پہنچ چکے ہیں ۔ حیدرآباد کی ادبی و ثقافتی تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے شہر کے باشعور لوگوں نے ہر دور میں اپنی صلاحیت کو منوالیا ہے اور آج ہم اُن بلند مرتبت ہستیوں کا نام لیتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں ۔ میری یہ دلی آرزو ہے کہ فاطمہ تاج اپنی بھرپور پہچان کے ساتھ اپنے ادبی سفر کو اسی طرح جاری رکھے ۔



غمِ دوراں سے غمِ جاناں تک

آدھی صدی ابھی نہیں گذری لیکن امکان ہے کہ آدھی صدی تک تو میں پہنچ ہی جاؤں گی، میری ابتدا غمِ دوراں کی آنکھ سے ٹپکا ہوا وہ آنسو تھی جس میں ساری کائنات سمٹ آئی تھی، یہ آنسو میرا آغاز تھا نا، اس لئے وہ فضا میں تحلیل نہ ہو سکا بلکہ اُس جگہ منجمد ہو گیا، جہاں کسی کا دامن تو کیا نظر تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اُس وقت سے آج تک رشتوں کے، محرومیوں کے، کامیابیوں کے، حوصلہ مندی کے، صبر و ضبط کے، آرزوؤں کے، حادثوں اور روایتوں کے کئی صحرا میں نے پار کئے، جہاں مجھے زندگی کے بے شمار سراب ملے لیکن اُس "آبِ حیات" کی کوئی بوند بھی میرے ہونٹوں تک نہ پہنچ سکی جو پل بھر کیلئے خوشی کا احساس دلا سکتی۔

میں میکے کے بند گھرانے سے نکلی تو سسرال کے اُس محل میں سجا دی گئی جہاں عورتوں کو بے جان چیزوں کی طرح صرف گھر کی زینت سمجھا جاتا ہے، قرطاس و قلم ان کے ہاتھ میں نہیں دیئے جاتے، مگر میں "ریکا" کا بُت تو نہیں تھی، جو ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی رہتی، میں زندگی کا جیتا جاگتا ثبوت تھی...... مجھے بھی کتابیں اور شعر و شاعری کا بچپن سے شوق تھا اور لکھتی بھی رہتی تھی۔ میرے اس شوق سے خسر اور میرے شوہر کو کبھی

ناگوار نہیں گذرا، بلکہ میرے شوق کو سراہتے ہوئے کئی بہترین اُردو کی کتابیں مجھے دی جاتی رہیں۔ میرے خسر مجھے اکثر ادبِ عالیہ سے متعلق کتابیں اور مذہبی کتابیں لاکر دیا کرتے تھے۔ میرے شوہر کو میرے شوق کا پورا اندازہ تھا، وہ بہترین ادبی ناول اور بہترین شاعروں کے مجموعۂ کلام دیا کرتے، جب کہ میں نے اپنے والد کی زندگی میں غالبؔ اور اقبالؔ کو ہی پڑھا تھا۔ خیر، مطالعہ کا شوق اتنا شدید تھا کہ میں کھاتے وقت بھی پڑھتی رہتی، تقریباً ہر گھر میں خواتین روایتی انداز میں رنگی ہوتی ہیں۔ میرا یہ انداز کسی کو بھی پسند نہیں تھا۔ میں اپنی دھن میں مگن رہتی اور تلخئ دوراں کے ہر کڑوے گھونٹ کو چٹخارے لے کر یوں پیتی جیسے شہد کی مکھیاں پھولوں کا رس لیتی ہیں یوں بھی مجھے جیل سے بھاگے ہوئے قیدی کی طرح حیات کے جنگلوں میں مارا مارا پھرنا اور کہیں گر کر دم توڑ دینا ذرا بھی پسند نہیں۔ میں نے سازگار اور ناسازگار دونوں حالات کے مقابلے کو ہی ہمیشہ زندگی سمجھا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ بچوں کی پیدائش نے خود ہی اس سلسلہ کو منقطع کردیا،

یوں بھی ــــ ؎ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

اس تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں کہ "شوقِ بے پناہ" کا بوجھ اپنے اندر اُٹھائے میرا وجود کس طرح ذمہ داریوں کی مہم سر کرتا رہا۔ یہ بتانا ضرور ہے کہ جب کسی حد تک ذمہ داریاں کم ہوئیں تو مجھ پر یاسیت طاری ہونے لگی، تنہائی کا احساس طوفاں کی طرح بڑھنے لگا۔ میں نے دوبارہ خود کو سمیٹا اور ہاتھ میں قلم اُٹھالیا، لیکن اس مرتبہ شوق کے ساتھ ساتھ شعور بھی

میرا ہمسفر تھا۔

ویسے کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ "تحریروں کی اشاعت سے سستی شہرت تو مل جاتی ہے لیکن عزت نہیں ملتی۔ یہ خود فریبی ہے اپنی انا کی تسکین کے لئے۔" میرا خیال بالکل مختلف ہے، میں سمجھتی ہوں کہ تحریروں کی اشاعت ہر قلمکار کی تمنا ہے، یہی تو مکمل تعارف کا سبب ہے۔ رہا عزت کا سوال تو اللہ عزت دینے والا ہے، اپنی انا کی تسکین ہو جائے تو آدمی دوسروں کو بھی تسلّی دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔ "انا" انسان کے اندر سیمابی کیفیت رکھتی ہے، بکھرا ہوا انسان مکمل نہیں ہوتا، سمٹی ہوئی ذات میں ہی تو وسعت ہوتی ہے۔ میں نے اپنے طور پر یہ سمجھ رکھا تھا کہ میری تخلیقات سے یقیناً میرے آس پاس کے لوگوں کو خوشی ہوگی، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتی کہ مجھے ان کا تعاون حاصل نہیں ہے لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں خاموشی کو ہی تعاون سمجھ لیتی ہوں، اور اس انتظار میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتی کہ یہ لوگ کبھی میرے شعر و ادب کے اس شوق میں میرے ہم خیال ہونگے۔

میرے شوہر خود بہت باصلاحیت بڑے قابل اور باذوق ہیں، کسی بھی موضوع پر ان سے گفتگو کی جائے، کہیں بھی ان میں ادھورا پن نہیں پایا جاتا، قانون، مذہب، شعر و ادب سے لے کر سیاست تک موضوع تک اُن سے بات چیت کرنے والا متاثر ہو جاتا ہے، ویسے میرے شوہر میری تحریریں پڑھتے ہیں لیکن تعریف یا تنقید کبھی انھوں نے کی نہیں، میرے شوقِ ادب کے لئے انھوں نے کوئی رکاوٹ بھی نہیں ڈالی۔ ان کی خاموشی کو ہی تعاون سمجھ کر قناعت کر لیتی ہوں

اور زندگی کی اُس آخری سانس کی منتظر ہوں جس کے بعد سب ہی میری تحریروں کے ایک ایک لفظ کو پڑھیں گے اور اُنھیں ہر لفظ میں "میں" نظر آؤں گی، مگر یہ سب میرے بعد ہی ہوگا نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

شاعروں، ادیبوں کے گھروں میں اِن حالات میں عام طور پر طوفان اُٹھتے ہیں لیکن میرے گھر کی خاموش فضا میں روایتی دامن کی دھجیاں خود میں نے اُڑا ڈالی ہیں، میں نے شوق کی "تشنہ ہوا" کو روکنے کی کوشش نہیں کی، اور یہ سب کچھ میں نے اپنے دائرہ میں رہ کر کیا ہے، اپنے فرائض سے تغافل کئے بغیر اپنے شوق کی تکمیل کی ہے۔

اِس بات سے میں بے خبر نہیں کہ میرے شوہر بھی میری تحریریں پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔ مجھے اُن سے شکایت نہیں، یہ کچھ رشتوں کے تقاضے ہی ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں خامیوں کو نظر انداز کر کے [illegible]، خوبیوں کا احساس کرتے ہوئے مرتبے کا احترام کرنا ضروری ہوتا ہے، لیکن احترام کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سانس لینا بھی چھوڑ دیں، زندگی کی علامتوں کو مٹا دینا کم سے کم میرے بس کی بات نہیں۔

میں ہر بات میں دوسروں کی رائے "پیشِ نظر" نہیں رکھتی۔ میرا اپنا یقین یہ ہے کہ میں آگ کے دریا سے گذر چکی ہوں لیکن خاک نہیں ہوئی۔ میں "کندن" بن جانے کی حدوں میں داخل ہو چکی ہوں۔ میرے خسر جو صدرِ خاندان تھے اُنھوں نے میری تحریروں کو بہت سراہا تھا، لیکن مجھے عمر بھر یہ افسوس رہے گا کہ اُن کی زندگی میں، میں نے بڑے

تساہل سے کام لیا۔ اگر آج وہ موجود ہوتے تو اس بات کی خوشی ان کو سب سے زیادہ ہوتی کہ ان کی بہو فاطمہ تاج کو بہ حیثیت شاعرہ و ادیب اپنا ایک مقام بنانے کے لئے کتنی کٹھن راہوں سے گذرنا پڑا ہے

کتنی موجوں سے گزرنا پڑا کشتی کو مری
میں نے ساحل کو تو پایا ہے مگر دیر کے بعد



معلوم نہیں لوگ حیات کو رشتے کے دائرے میں کیوں دھنسا دیتے ہیں شائد وہ اُس مرکز سے گھبراتے ہیں جو اِس دائرے کے درمیان ہوتا ہے۔ دائرے احاطہ تو کرتے ہیں مگر حفاظت نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ۔!



" انتقام " اُس درخت کی طرح ہے جس کی صرف " جڑ " ہی ہوتی ہے، شاخیں، پتے، پھول، پھل کچھ نہیں ہوتے۔ ۔ ۔ ۔



کاغذی پیرہن

(عابد علی خاں صاحب)

کتابیں اور پڑھنا، پڑھنا تو کسی کسی کے لئے ہوتی ہیں ہیں لیکن عابد علی خاں صاحب نے صحافت اور اُردو ادب کی خدمت کو اپنا شعار ایسے بنایا کہ خود "کاغذی پیرہن" بن کر رہ گئے جس پر اُردو ادب کے نقش و نگار تحریر بن کر جھلک رہے تھے صرف انجمنوں، اداروں، رسالوں اور روزنامے سے ہی وابستہ نہ تھے بلکہ ایک "مخیر" انسان بھی تھے اور طلباء کی سرپرستی، غریب و مصیبت زدہ خواتین کی پوری توجہ کے ساتھ مدد کیا کرتے تھے۔ بے روزگاروں کے لئے اتنی خاموشی سے روزگار کے دروازے کھول دیا کرتے تھے کہ ذرا بھی آواز نہ ہونے پاتی، کسی کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ایک ہمدرد اور رحم دل انسان کی بند مٹھی سے کتنے گھروں میں چراغ جل اُٹھے کئی بے کس بیواؤں، یتیموں کی سرپرستی اس انداز میں ہوتی کہ جیسے سب کے "پالن ہار" وہی ہوں، یہ بھی اللہ کی دین ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو پیغمبری جیسے کاموں کی ذمہ داریاں سونپ کر دنیا میں بھیج دیتا ہے، اور وہ میدان عمل میں کامیاب مجاہد کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنی زندگی سنوارتے ہوئے دوسروں کے بارے میں بھی سوچنا اور حتی الامکان ناخوشگوار حالات کو سازگار ماحول میں ڈھالنا

سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

آج عابد علی خاں صاحب ہم میں موجود نہ ہو کر بھی لگتا ہے کہ وہ ہیں اور ہمارے ساتھ ہی ہیں، ہمارے دل میں اُن کے بچھڑ جانے کے غم کے ساتھ یہ یقین بھی ہے کہ یہ "آفتابِ صحافت" نئے پیرہن میں نئے اُجالے لئے نئے نام کے ساتھ جلوہ گر ہونے والا ہے۔ محترم زاہد علی خاں صاحب اپنے والد کے زیرِ تربیت اور ان کا بازو بنے رہے، ان کی علالت کے دوران انہیں کی طرح کئی فرائض انجام دیتے آئے ہیں، اب اپنے والدِ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان کے اصولوں کی حفاظت کرتے ہوئے انشاء اللہ وہ بھی اُن زینوں پر چڑھتے چلے آئیں گے جہاں عوام کا تعاون ان کے ساتھ ہوگا، اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ بہت سی علمی خدمات اور علمی، ادبی وسماجی سرگرمیوں کا سلسلہ عابد علی خاں صاحب کی ذات سے جُڑا ہوا تھا وہ سلسلہ اب زاہد علی خاں صاحب کے ہاتھوں میں ہے، اِن کے والد کے دیرینہ رفیق جناب محبوب حسین جگر صاحب اپنے "یارِ غار" سے جدا ہوکر خود کو تنہا تو محسوس کر رہے ہوں گے مگر عابد علی خاں صاحب کا عکس زاہد علی خاں صاحب کی ذات میں دیکھ کر تسلی بھی ہو ہی جائے گی۔

جب میں بھی سب کی طرح ۱۲ر نومبر ۹۲ء کو اس ادب نواز ہستی کی قیامگاہ پر پہنچی تو ایک جمِ غفیر نظر آیا۔ زنانی حصے میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ یہی حال مردانے میں بھی تھا۔ لوگ بلالحاظ مذہب وملت آرہے تھے اور اپنے اپنے حساب سے خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ شاعروں، ادیبوں، ڈاکٹروں، صحیفہ نگاروں، منسٹروں، عہدیداروں، سرکاری و غیرسرکاری شخصیتوں اور امیر و غریب

ہر طرح کے لوگوں سے ان کی قیام گاہ پیمانۂ صبر کی طرح چھلکی جارہی تھی۔ ضرورت مند اور دکھی دل والوں کے آنسو پونچھنے والا آج زندگی سے بے پرواہ ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ اشکبار آنکھوں سے لوگ شہرِ حیدرآباد کی اس وضع دار شخصیت کا آخری دیدار کر رہے تھے۔ دوسروں کے درد و کرب اپنے اندر جذب کر کے مسکرا کر جیتے رہنے کا درس دے کر عابد علی خاں صاحب پُرسکون ابدی نیند سو چکے تھے۔ علالت کی خبر تو بہت پہلے ہی سُنی جا چکی تھی، آج ان کے انتقالِ پُرملال کے اطلاعی حادثے سے بھی گذرنا پڑا، حالانکہ ہم جانتے ہیں کسی کو بھی کسی موت کی خبر سُننا ہی پڑیگی کب؟ کیسے؟ کا سوال ہی بیکار ہے۔ پھر بھی دنیا میں کچھ لوگ ایسے تو ہوتے ہی ہیں جن کے بارے میں ہم یہ سُننا بالکل نہیں چاہتے کہ " وہ اب ہم میں نہیں رہے۔"

ایک عرصے سے ان کی طبیعت خراب تھی۔ ظاہر ہے کہ کئی تکلیف دہ ساعتوں سے گذرنا پڑا ہوگا مگر عمرِ طبعی کے سارے لوازمات ان کی زندگی کے آخری لمحوں تک ان کے ساتھ تھے، یعنی کہ ان کے افرادِ خاندان، ان کی بیگم، صاحبزادے، صاحبزادی، بہو، داماد اور بچوں کے بچے، بھائی بہن ماشاء اللہ سبھی پاس تھے اور ان سب کے درمیان اپنی یادوں کو چھوڑ کر جانا صرف خوش نصیبوں کو ہی میسّر ہوتا ہے۔

ان ہی کے روزنامۂ " سیاست " سے میرا تعارف ہوا، کئی بار سوچا کہ اُن سے ملوں یا کم سے کم فون پر ہی بات کر لوں اور اپنے خُسر مرحوم کا نام لے کر یاد دلاؤں کہ میں اُن کی بہو ہوں، مگر انتہائے شوق کے باوجود خودداری نے مجھے روک دیا۔ مجھے اپنی پہچان اپنے آپ بنانا تھی، بغیر کسی رشتے کے حوالے سے،

میں نے ہمت کر کے پہلی دفعہ اپنی تحریر جگر صاحب تک پہنچائی تو وہ کسی اعتراض کے بغیر شائع ہو گئی اور پھر بار بار ایسا ہوتا رہا۔ یقیناً میری تحریریں بھی عابد علی خاں صاحب کی نظر سے گذری ہوں گی۔ میں اُن سے ملی ہوں، کئی بار ملی ہوں لیکن فاطمہ تاج کی حیثیت سے نہیں بلکہ شاہد علی خاں صاحب کے کیمو رویل دواخانے میں پیشنٹ کی حیثیت سے ...... وہ اکثر صبح وہاں آیا کرتے دواخانے کے اسٹاف کو کچھ ہدایتیں دیتے ہوئے اور شاہد علی خاں صاحب سے بات کرتے ہوئے چلے جایا کرتے۔ آج اُن کے چہرے پر آخری نظر ڈالتے ہوئے مجھے وہ چہرہ یاد آیا جس پہ مسکراہٹ تو ہوتی تھی مگر پس پردہ فکر بھی ان کے چہرے سے کبھی کبھی عیاں ہو جاتی تھی۔ صحافت کی دنیا میں رہنے والوں کو بڑے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، سو انھوں نے بڑی بہادری سے سبھی حالات کا مقابلہ کیا اور غمِ دوراں کو اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ دمِ آخر تک اُردو سے وفا کرتے رہے اور قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کےلئے اُنھوں نے کیا نہیں کیا۔؟

خدمتِ خلق کے اِس "عابد" کی عبادتوں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ان کی ذات صرف شہر یا ملک تک محدود نہیں تھی، بلکہ ان کی ذات کا پھیلاؤ "دیارِ غیر" میں بھی اجنبیت کی دیواروں کو گرا کر اپنے پن کا احساس دلاتا رہا، ان کے روزنامے "سیاست" کی مقبولیت و انفرادیت نے کئی اہلِ قلم کو متعارف کروایا، صاحبِ علم و فن کو اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ آ کسی

رشتے میں باندھ دیا۔ "سیاست" میں لکھنے والے اور "سیاست" پڑھنے والے ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے بھی ایک کالم خواتین کیلئے مختص ہے۔ بہرحال سہ

اک پل میں آج طے ہوا صدیوں کا فاصلہ
وقفہ بہت تھا سانسوں کی رفتار کے لئے



ہم ماضی کی گذرگاہوں سے اتنے مانوس ہوتے ہیں، اتنے مانوس ہوتے ہیں کہ ہم اپنی پُرانی قیام گاہوں سے گذرتے ہوئے اُس جگہ کو مڑ کر ضرور دیکھتے ہیں جہاں پہلے کبھی ہم رہا کرتے تھے، حالانکہ وہاں "ہم" نہیں ہوتے!



رپورتاژ

محفلِ خواتین کی "شامِ غزل"

شدید گرمی سے بے تاب کسی چہرے پر پسینہ کی بوند کی طرح شام، زمین پر ٹپک پڑی تھی جس کے عکس نے ماحول کو کسی قدر سُرخی مائل کر دیا تھا۔ ہم یعنی نایاب سلطانہ صاحبہ، میری بڑی لڑکی اور میں اپنی کار میں نمائش کلب کی طرف چل پڑے۔ آج کی شام "شامِ غزل" کا عنوان لے کر آئی تھی۔ جوں ہی کار اجنتا گیٹ میں داخل ہوئی مجھے کئی اسکوٹروں اور کاروں کے علاوہ چار ایمبولنس بھی نظر آئیں۔ میں نے فوراً ہی نایاب آپا سے کہا آپا! انتظام بہت اچھا ہے، پہلے ہی سے چار ایمبولنس موجود ہیں۔ آپا نے لطیفی توجیہ میری طرف کرتے ہوئے کہا، ہاں! اگر شاعرات مجروح ہو جائیں تو کام آئیں گی۔ اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ہم ہنستے ہوئے منزلِ مقصود پر اُتر پڑے۔ کلب کے گیٹ پر مظفر النساء نازؔ نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر ہم کلب کے اندر پہنچے جہاں فاطمہ عالم علی خلیل سراپا شادمانی بنی کھڑی تھیں۔ غرض یہ کہ سلام و کلام کے بعد ہم آگے بڑھے تو کلب کے پہلے ہال میں صلاح الدین نیرؔ صاحب کا راج تھا جو بہت ہی خوش اسلوبی سے مردانے اور زنانے کو علیحدہ علیحدہ نشستوں کے راستوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اب ہم اندر والے ہال میں آ چکے تھے۔ موزوں روشنی میں سفید چاندنی پر رنگ برنگے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ سفید فرش پر بہت سی خواتین رنگ برنگے لباس میں پُروقار انداز میں بیٹھی تھیں۔ سامنے اسٹیج

تھا جس پر محترمہ سوڈا مستری صاحبہ اور بانو طاہرہ سعید صاحبہ کچھ مہکی مہکی باتوں میں معروف تھیں۔ انہیں کے سامنے محترمہ شاداں تہنیت صاحبہ اپنی آب و تاب کے ساتھ تمر جمالی اپنی رعنائیوں کے ساتھ اور سیدہ مہر صاحبہ اپنی سادگی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ہم سب ہی حسب مراتب سلام و دعا کے بعد بیٹھ گئے۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی "شامِ غزل" خود "غزل" بن چکی تھی۔ انتظام بہت اچھا تھا۔ عورتوں کو بڑے احترام کے ساتھ مردانے سے بالکل علٰحدہ بٹھایا گیا تھا۔ معتبر لوگ محفل میں آتے جا رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے کلب کا سارا ہال بھر گیا۔ اب ناز بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں جس کی سُرخ ساڑی کے پھول ان کے چہرے کے آگے ماند ہو رہے تھے۔ نایاب آپا سفید لباس میں ہنس کی طرح بیٹھی ہوئی سب کے ادبی نخروں کا جواب دیتی جا رہی تھیں اور مجھ سے بھی وقتاً فوقتاً مخاطب ہو رہی تھیں۔ بیگم زاہد علی خاں اور بلقیس علاء الدین صاحبہ اپنے باوقار انداز میں اپنی مخصوص جگہوں پر براجمان تھیں۔ میں نے چاروں طرف پھر نظر دوڑائی، خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہی جا رہا تھا۔ بہت سی پردہ نشین خواتین چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے چلی آرہی تھیں۔ مردانہ حصہ میں بھی بہت ہجوم ہو چکا تھا۔ بڑا مہذب و شائستہ ماحول تھا۔ آنے والے صاحبین کے ہر انداز سے اعلیٰ ظرفی و ذوقِ سخن نمایاں تھا۔ میں سوچنے لگی میری یہ پہلی شامِ غزل ہے جس میں میرا بھی کلام سازپر سنایا جائے گا۔ اتنی قابل شاعرات کے انتخاب کے بعد میرے لئے کیا گنجائش رہ جائے گی؟ دل نے مجھ سے کہا چپکے سے کھسک لو بے داد سے پہلے۔ مگر۔

ختم یہ سلسلۂ شوق کہاں ہوتا ہے

تقریباً سب شاعرات آچکی تھیں۔ مہمان خواتین کی گلپوشی کے بعد فاطمہ آپا نے پہلا کلام

کے آغاز کا اعلان کیا اور انتظامی اُمور سنبھالنے کے لئے قمر جمالی اپنی جگہ سے اٹھ کر مائک کے پاس آگئیں۔ آنے والے مہمانوں کے پیچھے شاعرات کو بٹھایا گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے میں لگی تھی۔ بھلا کہاں میں، ان کہنہ مشق شاعرات کی ہم نشست ہوسکتی تھی۔ میں سامعین کی صف میں ہی بیٹھی رہی۔ ساز کی آواز پر چونکی۔ سازوں کا سحر شروع ہو چکا تھا۔ حنا شہیدی کی دل پر اثر کرنے والی میری پسندیدہ غزل جگدیش کلہ کی زبانی ؎

حدیثِ درد سنانے سے فائدہ کیا ہے
وہ ہنس رہے ہیں رُلانے سے فائدہ کیا ہے

غزل بہت شاندار تھی۔ سماں بندھ گیا۔ پہلی غزل پر ہی شام پاؤں میں گھنگرو باندھے رقص کرنے لگی۔ ساز بج رہے تھے، رنگ جم رہا تھا۔ میں سامعین کی صف میں بیٹھی ہول کھا رہی تھی۔ نہ جانے میری کون سی غزل ہوگی کون سی دھن ہوگی ؟ اتنی داد تو ملنے سے رہی، شائد کوئی ایک اخلاقاً واہ کر بھی دے تو کیا فرق پڑے گا وغیرہ وغیرہ۔ میں انہیں خیالوں میں غرق تھی کہ مجھے ایک میری عزیز دوست آتی ہوئی نظر آئیں۔ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کے باوجود محفلِ خواتین کے اس نئے رنگ کو دیکھنے آئی تھیں۔ بطورِ خاص میری خاطر انھوں نے اتنی تکلیف اٹھائی۔ میری ڈھارس بندھی، میں بار بار بابِ الداخلہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری ایک اور عزیز دوست کا انتظار تھا، وہ ابھی تک نہیں آسکی تھیں نہ جانے کیوں ؟ دوسری غزل بھی شروع ہوگئی تھی، اچانک میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ فاطمہ آپا مجھے اپنے پاس بلا رہی تھیں۔ میں نے نفی میں ذرا سا گردن کو ہلایا تو ان کا اصرار کرتا ہوا ہاتھ اور چہرے کے تاثرات نے مجبور کر دیا۔ میں اُٹھ کر گوشۂ

شاعرات میں یعنی ستاروں کے جھرمٹ میں جا بیٹھی۔ یکے بعد دیگرے غزلوں کا سلسلہ تھا۔ شام رات بن کر جھومنے لگی تھی۔ بہت ہی شائستہ طرح سے داد دی جا رہی تھی۔ شوقِ جنوں نے کہا "تاج! تم کو بھی اب داد لے کر ہی اٹھنا ہے چاہے بیٹھے بیٹھے تمہارے پاؤں کسی محل کے ستون کی طرح گڑھ ہی کیوں نہ جائیں"۔ یوں دل کو سمجھا منا کر پوری طرح ساز و نغمہ میں غرق ہو گئی۔ پھر ایک بار ماحول کا جائزہ لیا۔ مردوں سے آخر اپنا لوہا شاعرات منوا چکی تھیں۔ لوگ بڑے شوق اور توجہ سے سُن رہے تھے۔ اچانک سحر جمالی نے اعلان کیا کہ بہتر ہوگا کہ شاعرات مائک پر آکر خود اپنا تعارف کروائیں۔ دل حلق میں اٹک گیا۔ ماحول گھومنے لگا، ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ شاعری "شیر" بن کر سامنے آگئی۔ اچانک ایسے میں ایک آواز پیچھے سے آئی "مناسب نہیں ہرگز نہیں"۔ میں نے گردن پھیر کر اس فرشتے کو دیکھنا ضروری سمجھا۔ صلاح الدین نیر قدامت پسند گھرانے کی بہو، بیٹیوں کے سر سے آنچل سرکتا دیکھ کر اپنے خلوص و احترام کی چادر ڈال چکے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ "محفلِ خواتین" کے لئے کسی بھی طرح باعثِ عزت نہ ہوگا اور ان کے انکار سے بات وہیں ختم ہو گئی۔

ایک ایک شاعرہ نگینہ تھی، ہر غزل شگفتگی، ذوق ادب کی شمعیں روشن کرتی ہی جا رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچا میرے دوست و عزیز بھی یقیناً آئے ہوں گے۔ محفل عروج پر تھی۔ میری قوتِ سماعت غرقِ نغمہ تھی۔ دل خوش کر دینے والا ماحول تھا اور بہت ہی خوشگوار (شہر کا نہیں صرف کلب کے اس ہال کا جہاں نغمے بکھرے ہوئے تھے) سازِ نے تارِ حیات چھیڑ رکھا تھا۔ میں اپنے نظریہ کے صحرا میں چہل قدمی کرتی رہی کہ نصف صدی پہلے غزل صرف عورت سے ہم کلامی کے معنی تھے آج غزل کا انداز

بدلا ہے۔ شاعری حالات کی منظرکشی پر اُتر آئی ہے۔ ؎

ملا ہے قرب مگر اعتبار باقی ہے
سمٹ گئے ہیں مگر انتشار باقی ہے

نایاب آپا کی غزل نے سامعین کو مسحور کر رکھا تھا۔ میں سوچتی رہی کہ آخر ثابت ہو چکا کہ عورت تخلیق کا ہر ہنر جانتی ہے، اپنے درد و غم کے اظہار میں، شکوے شکایات میں اور نفرت و محبت کے احساس کو لفظوں میں ڈھال کر کتنی نزاکت سے پیش کرتی ہے کہ مضبوط دل رکھنے والے بھی ذرا دیر واہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں (کبھی کبھی آہ بھی)

صدر محفل رو ڈا مستری صاحبہ کچھ دیر پہلے ناسازیٔ مزاج کے سبب جا چکی تھیں۔ بانو طاہرہ سعید صاحبہ کو صدارت سونپی گئی تو انہوں نے بھی معذرت کی اور جاتے جاتے نایاب آپا کو صدارت کے لئے کہہ گئیں۔ نایاب کی آپا کی صدارت میں محفل دمک رہی تھی ہنس کی طرح روشن شخصیت نایاب آپا سے بزم کی ہر شئے جگمگاتی ہی لگی۔ غزلوں کے کنول کھلتے ہی جا رہے تھے۔ ساز کی لہریں قدر و عزت کے موتی لئے دامنِ شوق بھرتی جا رہی تھیں۔ وکیل صاحب نے عظمت آپا کی غزل سے محفل کو گرما دیا تھا ؎

دردِ دل، کیفِ الم، سوزِ جگر سے پہلے
زندگی کچھ بھی نہ تھی تیری نظر سے پہلے

کچھ خواتین رفتہ رفتہ لوٹ رہی تھیں۔ پھر بھی کافی مجمع تھا۔ شائقین محونغمۂ سحر تھے۔ عورتوں کے کلام پر عزت سے داد دینے کا سلیقہ صرف اہل ذوق کو ہی ہو سکتا ہے اور پھر۔۔۔۔۔ اور پھر یوں ہوا کہ مجھ ناچیز کے نام کا اعلان ہوا۔ کسی طرح دم بخود بیٹھی رہی۔ دیوی رمتا مودتی کے کلاسیکل انداز اور سریلی آواز

نے میری غزل کو بھی آخر سجا ہی دیا ؎

جنہیں تھا ناز وہ اہلِ سفر نہیں آئے
ہمارے ساتھ کبھی راہ بر نہیں آئے

میرے دوستوں اور کرم فرماؤں نے مجھے بھی داد و قدر سے سرفراز کیا۔ آخر میں ڈاکٹر شمیم پروین کی لاجواب غزل پر "شامِ غزل" کا اختتام عمل میں آیا۔ بہنوں کے احترام کے پیشِ نظر جو ماحول تھا وہ بہرحال قابلِ تعریف تھا کیونکہ محفل بہرحال مخصوص نہیں تھی۔ اس طرح محفلِ خواتین کا پردہ رہ گیا جو خواتین کی خصوصیت بھی ہے۔

(سیاست ۵ اکتوبر ۱۹۹۰ء)



"احساس" جاگتا ہے تو "لفظ" سوجاتے ہیں اور معنے خود بخود کرنوں کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔



چہرہ ہمیشہ دل کا ترجمان نہیں ہوتا، کبھی ہم اس پر ضبط کا دبیز نقاب بھی تو ڈال لیتے ہیں نا، اس لئے ــــ!



محفلِ خواتین کی خواتین

(میری نظر میں)

فاطمہ عالم علی خاں

بوٹا سا قد، نرم آواز، شیریں لہجہ، عالمِ شباب میں یقیناً قیامتِ صغریٰ سے کم نہ رہی ہوں گی مگر اب تو سراپا محبت و شفقت ہیں جس طرح ملنے جلنے کا انداز شگفتہ ہے اسی طرح لکھنے میں خوب ہیں۔ قلم کی روانی سبحان اللہ، تحریر کا تسلسل لاجواب، بہت ہی شائستہ انداز میں لکھتی ہیں۔ ماضی کی یادوں کو یوں قلم بند کرتی ہیں جیسے ماہر فوٹوگرافر سامنے والے منظر کی ہر ہر زاویے سے منٹ بھر میں تصویر کھینچ لیتے ہیں اور کانوں میں رس گھولنے والا اندازِ بیاں کا کرشمہ یہ ہوتا ہے کہ جبیں پر ہمیشہ بل رکھنے والی خواتین بھی طمانیت کے احساس سے مسکرانے لگتی ہیں۔ یہ محفل کی جان ہیں اور فاطمہ عالم علی خاں کے نام سے مشہور ہیں۔ مجھے ان سے ادب و احترام کے ساتھ دوستی کا شرف حاصل ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے اور میں ان سے بے حد متاثر ہوں۔



سلطانہ شرف الدین

اب ذکر چھیڑتی ہوں سلطانہ شرف الدین صاحبہ کا۔ متناسب سراپا، بجامہ زیب شخصیت اور باغ و بہار طبیعت کی مالک ہیں۔ باوقار اندازِ تبسم بڑا دلنشین ہے۔ ہنسی کی کوئی بات ہو تو بچوں کی طرح بے اختیار قہقہے لگاتی ہیں اور انہیں یوں ہنستا دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہنستے، مسکراتے رہنے کا ہی نام زندگی ہے۔ اگر وہ اپنے استادانہ انداز میں کوئی سوال کر دیں تو معقول جواب موجود رکھتے ہوئے بھی زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ ان کی نظمیں، غزلیں اور مضامین سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ذرا سے واقعہ کو بھی گہرائی سے دیکھتے ہوئے اپنے احساسات اچھوتے انداز میں قلم بند کر لیتی ہیں۔ حادثوں کو منظوم کرنے میں لاجواب ہیں۔ اتنی خوبیوں کے باوجود مجھ ناقابل شاگرد سے محبت رکھتی ہیں۔



ڈاکٹر حبیب ضیاء

لیجئے! اسی بات پر "حبیب ضیاء" کی یاد آگئی ان کی شخصیت کو حد سے زیادہ سادگی نے بہت زیادہ پُرکشش بنا دیا ہے۔ طنز و مزاح کی اس

شہزادی کا جواب نہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ بڑی سنجیدگی سے اپنا مضمون سناتی ہیں۔ چہرے پر ذرا بھی تبسم نہیں ہوتا لیکن اہلِ محفل کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہوجاتا ہے۔ سنتے ہوئے، ہنستے ہوئے وقت پر لگا کر اُڑنے کے بعد بھی کافی دیر تک مسکراہٹوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ سادہ مزاج اور تبسم نواز ہستی مجھے بے حد پسند ہے۔



خورشید حمید پاشاہ

اب میں نام لوں گی " خورشید حمید پاشاہ " صاحبہ کا۔ اپنے نام ہی کی طرح بہت ہی نمایاں شخصیت کی مالک ہیں۔ رعب دار وضع قطع کے باوجود چہرے پر نرم مسکراہٹ کھلی رہتی ہے۔ چشمے کے پیچھے سے ہر ایک کا گہری نظر سے جائزہ لیتی رہتی ہیں، اور یہ ذہین نگاہیں دل میں اُترتی سی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ نہ صرف اچھی شاعرہ ہیں بلکہ وطن پرست بھی ہیں لیکن دوسروں کی تحریری و تقریری غلطی پر تنقید کرنے سے نہیں جھجکتیں اور یہی ان کی ادب دوستی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ایسے رہنما جنھیں مل جائیں، انہیں منزل کا یقین کیوں نہ ہو؟



نایاب سلطانہ

اور اب ایک نایاب ہستی کا ذکر کرنا چاہتی ہوں یعنی کہ " نایاب سلطانہ " صاحبہ ان کو جب دیکھتی ہوں، دیکھتی ہی رہتی ہوں۔ سادگی کے باوجود شخصیت میں شاہانہ پن پایا جاتا ہے۔ مرعوب کرنے والا انداز چہرے پر متانت ایسی کہ دیکھنے والا دوبارہ نظر ملاتے ہوئے گھبرا جائے لیکن درحقیقت بڑی با اخلاق اور ملنسار خاتون ہیں۔ چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں کا احترام ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ ان کا استادانہ کلام محفل کو لوٹ لیتا ہے۔ بڑی گہری اور فلسفیانہ شاعری کرتی ہیں۔ کاش! اس دُرِ نایاب کی کچھ ضیاء مجھے بھی مل جائے۔



ڈاکٹر رفیع رؤف

چہرے پر اوصاف حمیدہ کا نور، پاکیزہ کردار کی گواہی دیتا ہوا ممتا کا تقدس، مجھے ان کے چہرے پر ہمیشہ نظر آتا ہے۔ ہر ایک کو عزت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان کی نظر میں چھوٹا بڑا کوئی نہیں، سب ہی سے محبت و شفقت سے بات کرتی ہیں اور آج کے سماجی مسائل، مذہب سے دوری کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے بہت ہی مخلصانہ انداز میں

نصیحت کرتی ہیں۔ دوسروں کی تخلیقات دھیان سے سنتی ہیں اور حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ یہ ان خاتون اساتذہ میں ہیں جو علم کی ایک بوند سے دریا پیدا کر لیتے ہیں تاکہ لوگ جہالت کے سرابوں سے نکل کر فی الواقعی اپنی پیاس بجھا سکیں۔



آمنہ حیدر خان

رنگ جیسے دھوپ چھلکے، قد و قامت کردار کی طرح، بہت ہی نرم لہجہ، بتاؤں آپ کو ان صاحبہ کا نام کیا ہے؟ آمنہ حیدر خاں! شخصی تعلقات و رشتہ کو نظر انداز کرتے ہوئے خالص "محفلِ خواتین" کی ممبر کی حیثیت سے ان کے بارے میں ایک مشہور شعر موزوں سمجھتی ہوں۔ یہ ضرب المثل شعر ہے۔ ظاہر ہے کہ میرا نہیں ہو سکتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

محبت تو نہیں معلوم کیا ہے ۔ عقیدت آپ سے بے انتہا ہے

اس شعر کو میں ان کے تصور کے ساتھ لکھتی ہوں اور بس! ان کے بارے میں اتنا ہی فی الوقت کافی ہے۔



انور حیدر الدین

یہ بھی خوب رہی، سنجیدہ و متین مضمون نگارہ کا نام سن کر کسی "صاحب" کا

تصور ہوتا تھا لیکن جب ان کو محفل میں دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ یہ تو "صاحبہ" ہیں اور اپنے اندر بڑی صلاحیتیں رکھتی ہیں ۔ کئی زبان میں افسانے اور مضمون خوب لکھتی ہیں ۔ ادبی زبان میں بھی ان کو ملکہ حاصل ہے ۔ بہت کم گو اور بڑی سنجیدہ ہیں ۔ معیاری تحریر ان کی پہچان ہے ۔ حالاتِ حاضرہ کو گرفت میں لے کر ہر موضوع کو بہ حسن و خوبی بیان کرتی ہیں ۔ " نیلام گھر " غالباً قارئین کو یاد ہوگا ۔ موجودہ دور میں اصلاحی افسانے و مضامین لکھنے والوں کی بہت اہمیت ہے ۔



مظفر النساء ناز

سیدھی سادی لیکن بھیگی بھیگی پلکوں والی یہ شاعرہ بہت عرصہ سے میری نظر میں ہے ۔ شمع ، بیسویں صدی ، بانو اور بھی کئی رسالوں میں پڑھتی اور تصویریں دیکھتی آئی ہوں ، لیکن بالمشافہ تعارف " محفلِ خواتین " میں ہی ہوا ۔ ترنم بھی اچھا ، کلام بھی اچھا لیکن اس شاعرہ کی شبنمی پلکیں دل میں اترتی محسوس ہوتی ہیں ۔ ویسے تو میرے اور ان کے درمیان بے تکلفی بھی زیادہ نہیں لیکن اب تکلف بھی زیادہ نہیں ۔ " بات پھولوں کی " ان کا مجموعۂ کلام ، انھوں نے مجھے تحفہ دیا ہے " بات پھولوں کی " اور شبنمی آنکھیں جیسے کہ موسمِ بہار کی بات . . . . !

محفلِ خواتین کی سب ہی خواتین نازؔ پر بڑا ناز کرتی ہیں ۔ یوں بھی سادہ لوحی دل میں جلد جگہ کر لیتی ہے ۔ غرض کہ نازؔ اچھی شاعرہ ہی نہیں اچھی دوست بھی ہیں

مگر یہ بھیگی پلکیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !



قمر جمالی

سراپا ملاحت، چال میں ہلکی سی لچک، باتوں میں مٹھاس، چہرے پر نمک، بالکل "کریک جیک" بسکٹ کی طرح جو نمکین بھی ہے اور میٹھا بھی اور ہاتھوں میں "لاڈ بازار" سجا ہوا۔ جی ہاں! یہ شبیہہ قمر جمالی کی ہے۔ کبھی ان کے انداز میں بے اعتنائی پائی جاتی ہے تو کبھی منکسر المزاج لگتی ہیں۔ بہترین افسانہ نگار ہیں۔ اسی لئے آس پاس بکھرے ہوئے درد و غم کی کہانیوں میں کھوئی رہتی ہیں۔ حقیقتوں کا اظہار کرتے وقت ان کا قلم رُکے بغیر تحریر کو اس موڑ پر لے آتا ہے، جہاں پڑھنے اور سننے والوں کے منہ سے بے ساختہ "واہ" نکل جاتی ہے۔ "محفلِ خواتین" میں سنایا گیا ایک افسانہ "کعن" کی مرتبان والی مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ویسے قمر کو آفتاب بننے میں دیر کتنی ہے؟



لوگ اپنی خود نمائی کے لئے خودداری کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، حالانکہ خودداری کا اُجالا مانگنے کا نہیں ہوتا، بالکل دھوپ کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ !



ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

محفلِ خواتین سے "ربط خاص" رکھنے والی اور شہر حیدرآباد کی ادبی محفلوں کی جان کے بارے میں آج سوچا ہے کہ وہ لفظ لکھ ہی ڈالوں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ صرف میری نظر کی بات ہے۔ ان تمام خصوصیات کو دُہرانا میں اُس وقت مناسب نہیں سمجھتی جو سبھی لوگ جانتے ہیں۔ میں انہیں "محفلِ خواتین" کے چشمے کے پیچھے سے دیکھ رہی ہوں، جہاں یہ "مسندِ خاص" پر جلوہ افروز ہیں، ان کا نام ہے ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ۔ ظاہر ہے کہ قارئین چونک پڑے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ اس "نو مشق" کو کیا سوجھی کہ ان پر بھی قلم اُٹھا لیا۔ یہ تو بہت بڑی ادیبہ و شاعرہ ہیں، بھلا فاطمہ تاج کی یہ ہمت ؟ معزز قارئین! یہی تو آپ بھول گئے کہ ممتاز ہستیوں پر لکھنے کی جرأت اور بات ہے اور انہیں محسوس کرنا اور بات ہے۔ میں بانو آپا سے بے تکلف ہرگز نہیں، بھلا میری یہ مجال ؟ لیکن وہ جب جب بھی ملی ہیں مجھ سے محبت سے ملی ہیں۔ طرزِ تکلم نے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ ان کی طبیعت میں انسانی فطرت کی وہ معصومیت بھی ہے جسے خواہ مخواہ یا غیر ضروری "بیگانگی" کا نام دیا جاتا ہے۔ میرا جہاں تک اندازہ ہے (جی ہاں! میں ابھی تک اندازے کے ہی حد میں ہوں) وہ یہ کہ بانو آپا بہت اچھی اور ملنسار خاتون ہیں۔ مجھے ان کے کلام میں بڑے ہی "مستند" خیالات ملے ہیں۔ اپنے علاوہ دوسروں کے ماضی سے میل کھاتے ہوئے واقعات منظوم کرنے میں ماہر ہیں۔ میں تو ان کو محفلِ خواتین کا آفتاب لکھوں گی، ہے نا ؟



عزیز النساء صبا

یہ صحبتیں گلوں کی نہیں بلکہ ذکر صبا کا ہے۔ مطلب عزیز النساء صبا صاحبہ سے ہے۔ میں انہیں اُس زمانے سے سُن رہی ہوں جب کلام سنانے کیلئے ان کے اسٹیج پر آتے ہی ان کے سر اور ہاتھوں کے "پھولوں کے گجرے" مہک کر ان کے صبا ہونے کا اعلان کیا کرتے تھے۔ نام کا تاثر اب بھی ہے لیکن اب پھولوں کے گجروں کی ضرورت نہیں رہی اس لئے کہ وہ پھول کھلے ہیں گلشن گلشن ...... مخصوص ترنم اور بہترین شاعری کی سوغات لے کر جب صبا آتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے نا؟ "محفلِ خواتین" سے کچھ عرصہ غائب رہ کر پھر "محفلِ خواتین" کو مہکانے دوبارہ آنے لگی ہیں۔ اب ہم چند کلیوں پر قناعت کرنے والے نہیں ....



مسز برہان الدین

باپ رے باپ! میں نے ان کے بارے میں لکھنے سے پہلے کئی بار سوچا ہے کیا لکھوں؟ میں انہیں زیادہ جانتی نہیں، ہاں! زیادہ دیکھتی ضرور ہوں، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی میں ان کے چہرے پر کبھی سنجیدگی

نہیں آئی ہوگی۔ ہمیشہ تسلی آمیز مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی ہے۔ مجھ سے کوئی خاص تعلق نہیں لیکن سلام و خیریت جیسی رسمی گفتگو کا بڑی محبت سے جواب دیتی ہیں اور میں اسی پر اکتفا کر لیتی ہوں۔ ان کے روشن چہرے کی مسکراہٹ مجھے بے حد اچھی لگتی ہے جیسا کہ ممتا کا عکس ان کے ہی چہرے سے تقسیم ہوا ہو۔



عصمت نسیم سحر

یہ صرف اچھی بہت اچھی لڑکی ہی نہیں، بہترین افسانہ نگار بھی ہے۔ کبھی کبھی "محفلِ خواتین" میں آتی ہے تو یوں ملتی ہے جیسے "لگتا ہے کہ ہم جانتے ہوں جنم جنم سے" محفل کی سبھی خواتین کو "نسیم سحر" بہت پسند ہے اور مجھے بھی (ویسے یہ بات ایک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے، نسیم بھی مجھ سے محبت سے ملتی ہے) کیونکہ پسند وہیں غالب آجاتی ہے جہاں اخلاق و محبت کے تحرا تے پائے جاتے ہیں۔ "محفلِ خواتین" میں پہلے "نسیم" ہمیشہ آتی رہی ہے مگر اب بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے آنا جانا کم ہوگیا ہے لیکن جب بھی آتی ہے نیا افسانہ لے کر آتی ہے۔

معزز خواتین! آپ سب سے حسبِ عادت و رعایت میں معذرت تو ظاہر ہے کہ چاہوں گی کیونکہ میں ذرا روانی قلم سے گھبراتی ہوں۔ آج کل "بال پن" کا چلن ہے جو تحریریں اُگلتا جاتا ہے، ٹکتا نہیں۔ پہلے زمانے میں سیاہی میں قلم ڈبو کر یا

سیاہی کو قلم میں ڈال کر لکھا جاتا تھا آج سیاہی نوکِ قلم پہ منجمد ہے۔ اس لئے تحریر میں ٹھہراؤ کا آنا مشکل ہے اور مجھ جیسے لوگوں سے گستاخیاں تو ہوتی رہتی ہیں، چاہے وہ قلم کے بہانے ہو یا زبان کے بہانے۔ لیکن بتاتی چلوں خواتین کے بارے میں اس مرتبہ لکھا ہے ان سے تو مجھے خطوط یا تعارف کی توقع نہیں ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ ان کے پیار و محبت میں اور بھی اضافہ ہوگا۔ یہ اندازِ کرم، یعنی کہ ناچیز کو احساس ہے، اپنی نااہلیت کا پھر بھی شوق بہت بڑا ہوتا ہے، بار بار معافیاں مانگنی پڑتی ہیں، ہے نا؟ ہاں تو "محفلِ خواتین" کی "عزت خواتین" ———— ہاں مجھے امید ہے کہ آپ سب حسبِ روایت گستاخیِ قلم کو نظر انداز کر دیں گی، کر دیں گی نا؟



آر۔ بانو

عالمِ رنگ و بو میں اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کو کئی رازوں سے آگاہ کیا ہے وہیں بہت ساری باتوں کو پوشیدہ بھی رکھا ہے اور ان اسرارِ کائنات کے بارے میں اللہ نے کچھ عاجز اور کچھ قادر بندے کو زیادہ جاننے کی کوشش نہ کرنے کی تاکید بھی کی ہے۔ کچھ ایسی ہی پُراسرار اور اپنی طرف متوجہ کرنے والی شخصیت کا نام ہے آر۔ بانو صاحبہ۔ حیات کی بے شمار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بھی حضرتِ مریم کے معصوم مجسمے کی طرح نظر آتی ہیں۔ دردمند دل کی مالک ہیں۔ اپنی بے انتہا قابلیت کو انکساری کے دبیز پردے میں چھپا رکھا ہے۔ اربابِ وفا کی طرح ان کا شیوہ محبت رہا ہے۔

ان سے ملتے ہی مقابل پر موسم کی اولین بارش کی طرح اخلاق و محبت کے پھول برسنے لگتے ہیں۔ ان کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتی ہوں ؎

تم سلامت رہو قیامت تک اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو



حنا شہیدی

یہ تو بہت ہی پیاری شاعرہ ہے۔ اپنے کلام میں اپنے ترنم میں اپنے والد کی طرح انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ حنا محفل میں ہمیشہ اپنا گہرا رنگ جمالیتی ہیں۔ اچھوتے خیال لئے ہوئے شعر فضا میں مہکنے لگتے ہیں۔ حنا کی شخصیت بھی حنا کے اس شاداب پتے کی طرح ہے جس میں رنگ اور خوشبو بھری ہے۔ مجھے حنا بہت پسند ہے۔



سیدہ مہر

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا . . . . . .

ایک دوبار میں ہی "محفلِ خواتین" میں ان کا خاص مقام بن گیا ہے۔ یہ بڑی قابل اور باصلاحیت شاعرہ ہیں۔ ان کے سادہ سے پیکر میں شاعری کے کئی عالم جذب ہیں۔ تحت اللفظ میں پڑھتی ہیں اور اپنے ہر شعر پر داد وصول کرتی ہیں۔

کلام کا ہر رنگ نرالا ہے۔ کہنہ مشق اس شاعرہ کے کلام میں مہر و ماہ کی بلندی ہی نہیں، دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی روشنی بھی موجود ہے۔ میں ان کو پہلے ہی سے پڑھتی رہی ہوں لیکن محفلِ خواتین میں بہترین اضافہ ہوا ہے اور بڑی اُمیدیں ان سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ میری دعا ہے کہ ؎

خدا کرے کہ وہ آکر نہ جائے کبھی



گُل کوثر

نام کی طرح نفیس و نازک یہ "گُل" محفلِ خواتین میں موسمِ بہار کا سبب ہے شاداب گُل ہے اور ہر دل عزیز بھی۔ گُل لکھتی تو بہت اچھا ہیں لیکن بہت کم۔ کبھی کبھی کی تحریر ہم کو ہمیشہ تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ مشقِ قلم جاری رہے تو یہ "گُل" سدا بہار ہو جائے گا۔ محفلِ خواتین کو بہارِ مستقل کا بڑا انتظار ہے۔



ڈاکٹر عطیہ سعید

نئی نئی محفل میں آئی ہیں۔ کہنے کو تو "پیتھالوجسٹ" ہیں لیکن ان کے ادبی ذوق نے ان کو افسانہ نگار بنا رکھا ہے۔ کم بولنا اور زیادہ سننا ان کی عادت ہے۔

سادگی ان کی فطرت ہے اور اسی وجہ سے ان کی شخصیت بھی نمایاں ہونے لگی ہے۔ وضع قطع کے اعتبار سے بھی اور ایک قلم کار کی حیثیت سے بھی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی سادہ سی تحریروں میں بڑی معنویت پائی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مینارِ ادب کے زینوں پر چڑھتی جا رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہماری محفل کی بہت ہی با وقار افسانہ نگار ہوں گی۔ میں صرف اخلاقاً اور رسماً ہی ان سے ملی ہوں ——— "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں"

"محفلِ خواتین" کی معزز خواتین سے تیسری بار پھر معذرت چاہتی ہوں کہ انہیں کوئی بات ناگوار خدا کرے کہ نہ ہو . . . . .



شفیعہ قادری

آج میں شفیعہ قادری کے بارے میں لکھ رہی ہوں، اُنھیں یاد ہو کہ نہ ہو .... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شنکر جی مشاعرہ میں ایک دفعہ میری ملاقات اُن سے ہوئی تھی۔ اپنی محفلِ خواتین کی تفصیل بھی اُنھوں نے مجھے بتائی تھی، جب یہ معلوم ہوا کہ میں شاعری کرتی ہوں تو میرے سر ہوگئیں کہ میں محفلِ خواتین کی ممبر بن جاؤں، جبراً مجھ سے ایک غزل بھی لے لی تھی۔ دلکش چہرے والی شفیعہ قادری بار بار دعوت دے رہی تھی۔ میں کچھ تامل کر رہی تھی مگر ان کی مجبور کرتی آنکھوں کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنا پڑا اور یہ وعدہ کرنا ہی پڑا کہ میں ضرور ممبر بن جاؤں گی اور

پھر جب مشاعرہ ختم ہوا تو شفیعہ نے کچھ اونگھتے ہوئے، خدا حافظ کہتے ہوئے پھر یاد دلایا۔ میں نے بھی وعدہ کرلیا اور میں تو "پران جائے پر وچن نہ جائے" کے اصولوں کی پابند ہوں، سو میں نے کر دکھایا۔ بہرحال شفیعہ کی احسان مند ہوں کہ انھیں کے اصرار پر میں "محفلِ خواتین" میں شامل ہوگئی۔ شفیعہ مجھے پسند ہی نہیں، بہت پسند ہے۔



عصمت عظیم

عصمت عظیم کا لہکتے لہکتے اشعار سنانے کا انداز نرالا ہے۔ ان کا تو مجھے ہر انداز نرالا لگتا ہے۔ میں نے ان کو ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا ہے۔ کبھی سنجیدہ نہیں دیکھا۔ محفل میں آتی ہیں تو خوشبو پھیلنے لگتی ہے۔ اب خدا جانے یہ مہک کلام کی ہوتی ہے یا ان کے وجود کی، میں اندازہ ابھی تک نہ کرسکی۔



افروز سعید

چاند کے بادلوں کی اوٹ میں چھپ جانے کی تشبیہ مجھے اس وقت یاد آتی ہے جب میں نقاب اُلٹتے وقت افروز سعید کو دیکھتی ہوں، چہرے کے نقوش

میں بڑا بانکپن ہے ۔ بڑی سنجیدگی سے محفل میں "رونق افروز" ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار مسکرا دیتی ہیں، میں نے ان کو قہقہہ مار کر ہنستے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بہت اچھی افسانہ نگار خواتون ہیں۔ ان کے افسانوں میں اصلاحی پہلو ہوتے ہیں، جن کی موجودہ دور میں سخت ضرورت ہے، ہے نا ؟



رضیہ سلطانہ شاہین

پہاروں کی چٹانوں میں بسیرا کرتے کرتے نہ جانے یہ شاہین ہماری محفل میں کیسے آگیا ؟

میرا مطلب ہے " رضیہ سلطانہ شاہین " سے ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ممبر بنی ہیں اور شاعرہ بھی ہیں۔ ابھی ابھی غزلوں کا آغاز ہوا اور بہت خوب ہوا ہے، آگے خدا خیر کرے۔ ان کی سنہری آنکھیں کبھی کبھی مافوق الفطرت ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ آپ بھی غور کیجئے نا ....!



نسیم نیازی

محفلِ خواتین میں ایک ترنم نواز، مشہور و کہنہ مشق شاعرہ اب بہت کم آنے لگی ہیں، ان کا نام ہے نسیم نیازی۔ میں پہلے ان کو شاعر سمجھتی تھی لیکن دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ شاعرہ ہیں۔ سیاہ چشمہ ہمیشہ آنکھوں پر چڑھا رہتا ہے۔ دنیا کی رنگینیوں پر سیاہی ڈالنا سا لانکلسس کی بات نہیں۔۔ کلام سننے کا موقع بہت کم ملا ہے مگر جتنا بھی ملا ہے وہ بھی میں غنیمت سمجھتی ہوں یوں بھی ترنم والی شاعرات بہت کم ہیں۔ انھوں نے اپنا انداز برقرار رکھا ہے اور کافی نمایاں شخصیت کی مالک ہیں۔

معزز خواتین! ہمیں تو خطا کرکے بخشوانے میں مزہ آنے لگا ہے کیونکہ "محفلِ خواتین" کی سب ہی خواتین میرے لئے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دے رہی ہیں، تو اس مرتبہ بھی میں یہی اُمید رکھوں نا۔۔۔۔۔؟

(سیاست۔ ۱۹۹۱ء)



عظمت عبدالقیوم خان

میں عظمت آپا کے پائے نازک نہ دیکھ سکی لیکن ان کے نقشِ قدم محفلِ خواتین میں اب بھی تازہ ہیں۔ ان کے بارے میں پڑھا ہے، سنا ہے اور اتنا سنا ہے کہ ان کا وجود میرے تصور میں مجسم ہوگیا۔ ان کی ہمدرد طبیعت نے خواتین کو سماج میں سلیقے سے رہنے کا ہنر سکھایا۔ ایک ایسی محفل کی بنا رکھی جو صرف خواتین کے لئے تھی۔ ایک دوسرے سے ملنے جلنے تعلیمی مباحثے، علمی مشاغل اور شعر و ادب کی سوغاتوں سے بھرپور اس محفل کا نام "محفلِ خواتین" رکھا گیا جس کے طفیل میں نہ صرف تعلیم یافتہ بلکہ قدامت پسند گھرانے کی ادیب و شاعرات کے لئے بھی راہیں ہموار ہوئیں۔ گھریلو مسائل اور ذمہ داریوں سے تھکنے کے بعد ذہن کو کچھ آرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آرام محفلِ خواتین میں سجے سجائے خوان کی طرح مل جاتا ہے۔ محفل میں اجنبی خواتین بھی آتی ہیں لیکن کچھ ہی دیر بعد محبت زدہ ماحول میں گھل مل جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ عظمت آپا کے حسنِ سلوک اور اخلاق کا سکہ ابھی تک چل رہا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی بعد الموت بھی اپنے رفیقوں میں زندہ رہے۔ ان کی کامیابی کی ایک وجہ اور بھی تھی وہ تھے ان کے شوہر۔ انھوں نے بیوی سے نہ صرف تعاون کیا بلکہ ہمیشہ ان کے ہم خیال بنے رہے۔ شائد وہ بھی اپنی قدامت پسند گھرانے کی بہنوں کی دماغی یکسوئی چاہتے تھے۔ بہرحال عظمت آپا کی عظمت ان کے بعد بھی کم نہیں ہوئی

اور نہ ہو سکتی ہے لیکن ان کی یاد ہمیشہ اہلِ محفل کو بے قرار کر دیتی ہے۔ میں خود بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہوں جیسے کہ وہ صدارت کی کرسی پر بیٹھی میری منتظر ہوں اور دیر ہو جانے پر مجھ سے پوچھ رہی ہوں کہ "اتنی دیر کیوں کر دی ہے" جس کا جواب میں مسکراہٹ سے دیتے ہوئے آپا کی دست بوسی کرتی ہوں اور مجھے بہت ہی محبت سے گلے لگا لیتی ہیں۔ عظمت آپا نے محفلِ خواتین قائم کر کے ادبی ذوق رکھنے والی خواتین پر بڑا احسان کیا ہے، یہاں سے خواتین شعر و ادب سے وابستہ ہونے لگیں۔ علم و ادب کے لئے کوئی شرط نہیں، اس لئے گلشن سے کئی فاختائیں علم و ادب کا پیغام لے کر اُڑنے لگتی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں بھی خواتین کا بہت اچھا مقام ہو گیا ہے۔ بہترین افسانہ نگار، تبصرہ نگار، مزاحیہ مضامین، غزلیں اور نظمیں لکھنے والی موجودہ خواتین ان شمعوں کی طرح روشن ہیں جن سے کئی چراغ جلتے جا رہے ہیں۔ روشنی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ کچھ گھرانے ایسے ہیں جو ان چیزوں کو ابھی تک فضول اور بے فیض سمجھتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ عورتوں کو اپنے فرائض کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اپنی شناخت بھی کروانی ہے اپنا مکمل تعارف بھی کروانا ہے۔ اپنا وہ مقام بھی حاصل کرنا ہے جسے قدر و مرتبہ کہا جائے۔ عظمت آپا بڑی اچھی شاعرہ تھیں، شعر و سخن کی محفل کا میں اگر انہیں ماہتاب کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے کلام میں خیالوں کی تابانی اور حوصلوں کی بلندی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگاتی ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

ہزاروں غم سہی لیکن شعورِ غم عطا کر کے　　سلیقہ ہم کو جینے کا سکھا دیتے تو اچھا تھا
ترے لطف و کرم کا ایک لمحہ　　کہیں بہتر ہے عمرِ جاوداں سے

دردِ دل، کیفِ الم، سوزِ جگر سے پہلے ۔ زندگی کچھ بھی نہ تھی تیری نظر سے پہلے
کسی منزل پہ رک سکتا نہیں ذوقِ سفر اپنا ۔ فروزاں کر کے ہم منزل کو منزل سے گذرتے ہیں
جب بھی ہوئے جادہ و منزل کے تذکرے ۔ دیوانگیٔ اہلِ وفا اور بڑھ گئی
ہزاروں حادثے گذرے ہیں پھر بھی ۔ مزاجِ زندگی برہم نہیں ہے
یا منزلوں کے ذکر سے تم نے دیا فریب ۔ یا ہم ہی محوِ گردِ رہِ کارواں رہے
کم نہیں ہیں گلوں سے کانٹے بھی ۔ دلکشی گر تری نگاہ میں ہے

مضامین اور افسانے عظمت آپا کی "دیدہ وری" کی قسم کھاتے ہیں۔ خیالوں کا نزول ہوتے ہیں۔ ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر ذرا ہی دیر میں رنگ دیتا تھا۔ زمانے کے سب رنگ لئے ہوئے ان کی تحریر ہر پہلو سے بے مثال ہے۔ محفل میں ان کے وجود کی مہک اب بھی محسوس ہوتی ہے۔



"کبھی یاد رکھنا مشکل اور بھول جانا آسان ہوتا ہے تو کبھی یاد رکھنا آسان اور بھول جانا مشکل ہوتا ہے، معلوم نہیں کیوں ۔ ۔ ۔ ؟"



سلطانہ شرف الدین

محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ کا نام لیتے ہی نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ مصری کی بڑی سی ڈلی میں نے منہ میں رکھ لی ہو، آپ بھی یہی محسوس کرتے ہوں گے؟ ہے نا؟ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ شخصیت کے خمیر میں خلوص و شیرنی شامل ہو تو مٹھاس کا احساس یقینی ہے۔ بہت برسوں پہلے انتہائی متناسب خد و خال کی اس ہستی کا سایہ میرے حافظہ کی تہہ میں آرام کر رہا تھا " محفلِ خواتین " میں یہ سایہ مجسم میرے سامنے تھا۔ بھلا سلطانہ آپا سے کون واقف نہیں، مجھ جیسی (پڑھائی چور) شاگرد تو شاید کوئی ہو لیکن ان کے شاگردوں کو ان سے بہت کچھ ملا ہے۔ قابلیت، اخلاق، معیارِ زندگی انھوں نے سب ہی کچھ تو تقسیم کیا ہے۔ اب میں اصل موضوع پر آنا چاہوں گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ سلطانہ آپا کا خلوص میرے حق میں تو واقعی نعمتِ عظمیٰ ہے۔ ہمیں مذہب یہی تعلیم دیتا ہے کہ اس گھر میں نہ جایا جائے جہاں صاحبِ خانہ کے دیدہ و دل فرشِ راہ نہ ہوں اور سلطانہ آپا کے گھر کی طرف تو دوڑ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سب ہی سے اتنے پیار اور خلوص سے ملتی ہیں کہ " ہر ایک کو یہ گماں ہے مخاطب ہمیں رہے "۔ ویسے تو یہ قطعی بات ہے کہ سلطانہ آپا نے مجھے محبت دینے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی۔ کبھی بھی اس معاملے میں کفایت شعاری نہیں کی۔ محبت کا یوں بھی حساب کتاب نہیں ہوتا، ہمیشہ

سلطانہ آپا یہی کہتی ہیں ' اپنا میکہ سمجھ کر آؤ ' اپنا گھر سمجھ کر آؤ ۔ اپنے شوہر کے ساتھ آؤ ' بچوں کو لے کر آؤ ' مجھے خوشی ہوگی ۔ اور ان کی پُر بہار شخصیت نے ہمیشہ زندگی کے خوشگوار لمحوں کا احساس دلایا ہے ۔ بہترین شاعرہ ' بہترین ادیبہ ' شفیق مدرسہ کے علاوہ یہ سچی دوست بھی ہیں ۔ ان کے مطالعہ کا شوق آج بھی شباب پر ہے ۔ دل میں اُتر جانے والے کلام نے انہیں اور بھی دل نشیں بنا دیا ہے ۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ میں ان کی شاگرد رہ چکی ہوں (اتفاق کی بات ہے کہ ان کے دیئے ہوئے درس یاد نہ رہ سکے) ہائے ! کس قدر پیارا طرزِ زندگی ہے ان کا ' پودوں کا انتخاب ' افسانوی بڑی ہی شاعرانہ طرز کی باغبانی ' بہت ہی سلیقہ سے آراستہ ڈرائنگ روم ' بیڈ روم اور ڈائننگ ہال ' بڑے ہی شوخ رنگوں کے پردے اور کُشن کور ' نئے طرز سے سجے ہوئے گلدان اور تو اور " کال بیل " بھی شاعرانہ ہے ۔ " باب الداخلہ " پر چھوٹی چھوٹی سنہری گھنٹیاں لگی ہیں جنہیں بجا بجا کر میں نغمۂ زندگی کی لے کو محسوس کرتی ہوں ۔ غرض کہ رنگین ماحول ' پُرسکون تنہائی ' جہاں ذرا بھی اضطراب نہیں ' کہیں غم کی پرچھائیاں نہیں ' محبت کے اس پیکر سے ملنے کو بار بار دل چاہتا ہے ' بار بار باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ تعلیم و تدریس سے متعلق باتیں ہی نہیں کرتیں بلکہ شعر و ادب کی کئی داستانیں ان سے سُنی جاسکتی ہیں ۔ دن تو کیا ان سے باتوں میں عمر بیت جائے تب بھی پتہ نہ چلے ' لگتا ہے کہ بس بہاروں کا قافلہ رواں ہے ۔

اندازِ گفتگو نے ہمیشہ ہی پھول برسائے ہیں ' ہمیشہ ہی روح کو معطر کیا ہے ۔ سلطانہ آپا سے مل کر بھی دل نہیں بھرتا ' کبھی نہیں بھرتا ۔ ان کی محبت ایسے زخموں کے لئے مرہم ہے جو گردشِ دوراں کے دیئے ہوئے ہوتے ہیں ' ان کی طرح گھونٹ گھونٹ اگر جامِ

زندگی پیا جائے تو واقعی مزہ آجائے۔ سلطانہ آپا دل کھول کر قہقہے لگاتی ہیں اور اپنے کسی ساتھی کو ذرا دیر بھی اُداس نہیں رہنے دیتیں کہتیں ہیں " زندگی جینے کے لئے ہے، غم تو ہوتے ہی ہیں لیکن غم کا اظہار ضروری نہیں۔ یہ جامِ تلخ پیا جاسکتا ہے۔ خود خوش رہو اور خوشی تقسیم کرتے رہو۔" میں ان کی طرزِ زندگی سے بہت متاثر ہوں کہ " ہم سے تو ایسے پیا جائے نہ۔۔۔۔۔"

جتنی دیر سلطانہ آپا کی ہم نشینی میسر آتی ہے اتنی دیر تک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی صرف بہار ہے، صرف بہار۔ بقول شاعر ؎

تحفے دیئے ہیں اتنے تمہاری نگاہ نے - ہے دامنِ خیال گلوں سے بھرا ہوا

سلطانہ آپا کی باتیں بڑی پُرلطف اور بڑی مستند دلائل لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے زیادہ بولنے کی مجال نہیں ہوتی۔ بس سننے کو جی چاہتا ہے، سنتے ہی رہنے کو جی چاہتا ہے۔ تجربے کی باتیں، علمی باتیں، گھریلو سگھڑ باتیں اور۔۔۔۔

موسم کی تازہ خوشبو میں کل بھیگتے ہو جسے - کچھ دیر ہم بھی پھولوں کی برسات میں رہے

سلطانہ آپا کی قابلیت و خلوص کا سکہ اب بھی چل رہا ہے لیکن میں نے ان کی محبت کے نئے نئے کرارے نوٹ چھاپے ہیں۔۔۔۔ ہے نا؟۔۔۔۔

(سیاست۔ ۲۹ مارچ ۱۹۹۲ء)



سلطانہ آپا امریکہ جانے والی تھیں، چار دن پہلے ہمیں فون کر کے بلایا آکر مل لیں۔ دن مقرر ہوا اور ہم تین بجے کے بعد سلطانہ آپا کے دولت کدے پر پہنچے

"ہم" سے مطلب، میں اور نایاب آپا، گیٹ کے اندر میں نے قدم رکھا اور دستک دی۔ ایک خادم چاندبی نے آکر کہا بی بی جی صبح سے شاپنگ کے لئے گئی ہیں، ابھی تک نہیں آئیں، ابھی آتی ہی ہونگیں۔ آپ لوگ بیٹھئے۔ بات ہو ہی رہی تھی کہ اُن کا کُتّا بھونکنے لگا اور آگے بڑھنے لگا۔ انداز تو خطرناک نہیں تھا مگر کُتّا، کُتّا ہی ہوتا ہے۔ میں فوراً واپس آٹو میں جاکر بیٹھ گئی، جس میں سے ابھی تک نایاب آپا اُتری نہیں تھیں۔ خادمہ نے کُتّے کو سمجھایا اور وہ چُپ ہوگیا۔ غرض کہ ہم کو اندر بلایا گیا۔ ہم جاکر اُن کے مختصر اور ڈیسنٹ ڈرائنگ ہال میں بیٹھ گئے۔ نیلے پردوں کی وجہ ماحول نیلگوں ہوگیا تھا۔ میں سوچنے لگی یہ ایک ایسی خاتون کا مکان ہے جس نے علم و فن کے کئی جام پی رکھے ہیں لیکن لغزش نام کو نہیں۔ باتوں میں ٹھہراؤ، خیالوں میں ٹھہراؤ، خدا بھی تو نہیں لڑکھڑائیں۔ اِس پُرسکون تنہائی میں تو شائد انھوں نے کئی دیوان مرتب کرلئے ہوں گے۔ انسان طبعی عمر کو پہنچنے تک تمام فرائض کی تکمیل اگر کر سکے تو پھر اُس کا ہر غم سکونِ قلب میں بدل جاتا ہے۔ میں نے صحن میں نگاہ دوڑائی، آپا کو باغبانی کا بھی شوق ہے۔ پودوں کا انتخاب بھی شاعرانہ ہے۔ دیوان خانے اور صوفہ سیٹ کے کور اور اُن سے ملتے ہوئے پردوں کے رنگ بھی "عالمِ خواب" میں لے جاتے ہیں ـــــ میں نے یوں ہی اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا، پھر نایاب آپا سے باتوں میں لگ گئی۔ یہ بھی آخر ٹھہریں نایاب آپا، میں نے جب اصرار کیا تو اپنے کچھ اشعار سنانے لگیں ؎

یہ عزم آشیاں بندی تو دیکھو - خبر رکھتے ہوئے ردِ عمل کی

واہ، واہ، میں تو سرشار ہوگئی، عین اُسی وقت نایاب آپا کی کرسی کے پاس آکر

سلطانہ آپا کا کُتّا بیٹھ گیا۔ نایاب آپا کتّوں سے بہت زیادہ گھبراتی ہیں۔ پاؤں اوپر کر کے بچوں کی طرح بیٹھ گئیں اور حیرانی پریشانی سے مجھ سے کہا۔ " اب کیا ہوگا ؟ " سوال کا انداز ایسا تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ اُن کے چہرے کی سنجیدگی قابلِ دید تھی۔ یقین مانئیے میں اگر مصوّر ہوتی تو وہ تصویر اُتار دیتی، مگر گنجے کو ناخن کہاں ؟ میں نے اُن کی خادمہ کو بلایا (چلّاکر) کیونکہ میں بھی کرسی کے اوپر پاؤں رکھے بیٹھ گئی تھی اور کرسی میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ دوسری طرف چھلانگ لگائی جاسکے۔ خیر! لڑکی آئی اور اس شریف کُتّے کو دوسری طرف لے گئی کیونکہ وہ نایاب آپا کے قدموں میں بڑے اعتقاد سے سر جھکائے نیم خوابی میں تھا ؎

خبر رکھتے ہوئے ردّ عمل کی ۔ ۔ ۔ ۔

ساڑھے چار بجے سلطانہ آپا آئیں۔ ہم اس دوران گھر کا تفصیلی جائزہ لے چکے تھے۔ سلطانہ آپا نے بار بار تاخیر کی معافی چاہی، گلے لگایا، پیار کیا، اور ساری تھکن بھول کر چائے کا آرڈر دے کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں۔ ہمارے آنے کی خوشی کا کہکشاتی منظر اُن کے چہرے سے عیاں تھا " دل شاد شاد " قہقہے اور شاعرانہ باتیں کرتے ہوئے انھوں نے وہ ساری خریدی ہوئی چیزیں ہمیں دکھائیں جو انھیں امریکہ لے جانا تھا، سب ہی کچھ خرید لیا تھا۔ پھر بھی کچھ باقی تھا۔ خیر! چائے لوازمات کے ساتھ آگئی۔ سلطانہ آپا کے ذوق کے قربان ہونے کو جی چاہا، ایسے حد فرحت بخش چائے ہوتی ہے ان کے یہاں کی۔ اُنھوں نے عائشہ رشاد کو خادمہ کے ذریعہ بلا بھیجا۔ وہ ذرا دیر میں آگئیں۔ میں نے برسوں پہلے اُن کو دیکھا تھا۔

جامہ زیب، دلکش شخصیت یوں بھی بھلائی نہیں جاتی۔ آج " ڈھلتے ہوئے سورج کا سفر سوئے شفق " دیکھا، دل باغ باغ ہوگیا۔ جس کو دیکھا تھا سُنا تھا۔ آج اُس شخصیت سے تعارف ہوا۔ شیریں لہجہ، دلنواز تبسم اب بھی جوں کا توں تھا۔ انھوں نے چائے پی نہیں۔ کیونکہ وہ گھر سے چائے پی کر آئی تھیں سلطانہ آپا نے میرا بھی پیار و محبّت سے تعارف کروایا۔ نایاب آپا تو پہلے ہی معروف ہیں۔ آخر میں غزلوں کی فرمائش ہوئی نایاب آپا نے دو غزلیں شاندار سی سنائیں۔ پھر سلطانہ آپا اور عائشہ آپا کے اصرار پر میں نے بھی اپنی غزل سنائی۔ " زندگی ہم کو نظر آئی سرابوں کی طرح . . . " غزل بہت پسند کی گئی۔ شام ہوچکی تھی۔ عائشہ آپا چلی گئیں، ہم بھی اُٹھے اور سلطانہ آپا کو باری باری امام ضامن باندھا، گلے ملے، ہاتھ چوما، میں نے گلے لگتے لگتے اس مستقل یاد کا ایک طویل لمحہ (صدیوں جیسا) اپنی ذات میں جذب کرلیا۔ اُن کی آنکھیں بھر آئیں تھیں، لیکن ہم نے مسکراتے ہوئے اُنھیں الوداع کہا۔ اگر ہم اپنے آنسو بہا دیتے تو اُن کے لوٹ آنے کی خوشی تک یہ پیمانہ کیسے چھلکتا؟ بہرحال پیاری سی شام، پیاری سی ہستی کے ساتھ گذار کر ہم گھر لوٹ گئے۔ یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ سلطانہ آپا پان کی عادی نہیں لیکن مہمانوں کی تواضع کے لئے پاندان ضرور رکھتی ہیں اور بہت ہی مزیدار پان بناکر کھلاتی ہیں۔



میں اپنے کمرے میں تھی، میری چھوٹی لڑکی نے آکر کہا " امّی! آپ کے لئے فون ہے "۔ میں کمرے سے نکل کر ڈرائنگ ہال میں آگئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی، شام کے

ساڑھے سات بجے تھے، میں نے ریسور اُٹھایا اور "ہیلو" اُدھر سے آواز آئی۔
"ہیلو" .... میں نے شناسا آواز اور مانوس لہجہ محسوس کرتے ہوئے پھر دوبارہ پوچھا "ہیلو؟" جواب ملا "ہیلو فاطمہ ...." "ہائے میری آپا جی آپ آگئیں؟ اللہ آپ آگئیں؟" میں خوشی سے چلا پڑی، سلطانہ شرف الدین صاحبہ کا پیار بھرا قہقہہ ریسور میں گونج رہا تھا، میں نے فون کلیجے سے لگا لیا، "آپا آپ کب آئیں؟"۔ میں نے پوچھا۔ "ارے یار بس دو دن ہوئے دم لے کر تمہیں پہلا فون کیا ہے"۔ آپا غالباً مسکرا رہی تھیں۔ خط برابر نہ ملنے کا شکوہ ختم ہوا تو خیریت پوچھی، آپا نے بتایا کہ 'پاؤں میں ذرا تکلیف ہے پردیس سے دُکھ" لے آئی ہوں۔ میں نے کہا۔ کوئی بات نہیں "فرشِ وطن" پہ چلنے کے بعد درد کم ہو جائے گا، آپا مخصوص انداز میں قہقہے لگاتے ہوئے میری اور بچوں کی خیریت پوچھتی رہیں۔ میں بے چین تھی، آپا میں آپ سے ملنے کے لئے آرہی ہوں! آپا نے کہا ضرور آؤ میری جان، کب آرہی ہو؟ میں نے کہا، اگر میرے بس میں ہوتا تو ابھی آجاتی یا پھر صبح فجر کی نماز پڑھ کر نکل آتی، لیکن رسمِ دنیا کے مطابق کل کسی وقت بھی حاضر ہوں گی۔ میں خوشی سے جھوم اُٹھی، آپا نے کہا کہ تمہارے مضامین کی کافی شہرت سنی ہے، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا کیا لکھا ہے؟ میں نے کہا کہ میں ضرور سناؤں گی اور فاطمہ آپا اور نایاب آپا کو فون پر آنے کی اطلاع دینے کیلئے مجھے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ اُن کی پیار بھری باتیں ابھی تک میرے کان سُن رہے ہیں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا ہے کہ شہر کی ہوا کا دامن خوشبو سے بسا ہوا ہے۔ میں رات بھر نہ جانے کیسے سو سکوں گی؟

مجھے آپا سے ملنا ہے نا ! مجھے یاد آتی رہتی ہیں آپ کی باتیں، سلطانہ شرف الدین کی باتیں، انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ " فرائض کی تکمیل کرتے ہوئے کچھ سانسیں اپنے لئے بھی لیتی رہو اور اسی وقت جو لمحے تمہارے ہاتھ میں ہیں ان لمحوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھاؤ، ان لمحوں کی قدر کرنا سیکھو، اپنی صلاحیتوں کو دفن کرکے اپنے آپ کو مٹانے سے بہتر ہے کہ اپنی قابلیت سے اچھا مقام بنانے کی کوشش کرو۔" سلطانہ آپا کی اس نصیحت نے مجھے غور و فکر پر مجبور کیا، دل میں چھپ کر بیٹھی ہوئی آرزو نے انگڑائی لی اور سر اُٹھا کر پوری طرح جاگ پڑی۔

آج یعنی 10 دسمبر 1991ء کی شام مجھے بہت ہی اچھی لگی۔ سلطانہ آپا نے مجھے اچانک چونکا دیا۔ میں دبے پاؤں اچانک چلی آنے والی خوشیوں کی ہمیشہ ہی منتظر رہتی ہوں کیونکہ اس طرح کی خوشیاں بہت کم آتی ہیں، جو ہم سوچتے ہیں وہ ہو جائے تو اس کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔ اہتمام سے بلائی جانے والی خوشی میں زیادہ دلکشی نہیں ہوتی ہے نا ؟ کچھ دنوں سے یوں بھی مجھے اپنا ٹیلیفون جگمگاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، آج تو ٹیلی فون بہکنے بھی لگا ...... ہے نا .... !



شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا، کبھی اک چراغ جلا دیا

لیجئے ! آخر وہ گھڑی آ ہی گئی۔ میں اور نایاب آپا، سلطانہ آپا کے گھر کی طرف چل پڑے۔ راستہ خیالوں میں گذر گیا۔ گیٹ پر مجھے دیکھ کر سلطانہ آپا کی خادمہ بی جان

دوڑتی آئی، سلام کرتے ہوئے پھاٹک کھول دیا۔ میں اور نایاب آپا گھر میں داخل ہو گئے صحن سے اوپر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس ورانڈے نما چبوترے پر لگے پودوں اور بیلوں پر بہار چھائی ہوئی ہے، سارا ماحول مہکا ہوا تھا۔ گلاب تازہ تازہ کھلے ہوئے تھے۔ ہم اندر ہال میں داخل ہو گئے۔ سلطانہ آپا کمرہ سے نکل آئیں، مجھے بار بار گلے لگایا، پیار کیا۔ نایاب آپا کے گلے لگیں، وہی مسکراہٹ جو اُن کی پہچان ہے۔ اب بھی لبوں پر تھی۔ میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔ سلطانہ آپا نے مجھے پھر گلے لگا لیا "میری جان، میری دوست، میری بیٹی تم کو میں بہت یاد کرتی رہتی ہوں، تم نے بھی یقیناً مجھے یاد کیا ہوگا جانو! تم تو میری جان ہو۔ سلطانہ آپا کے محبت سے بھرپور جملوں نے اور بھی اشکبار کر دیا۔ پیمانے جب ہی چھلکتے ہیں جب لبریز ہو جاتے ہیں۔ خوشی زیادہ ہو گئی تو آنکھوں سے ٹپک پڑی، میں نے خود کو سنبھالا، سلطانہ آپا سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ نایاب آپا چھوٹے سے دیوان پر جم گئیں، میں نے اپنی جگہ سنبھالی اور سلطانہ آپا سے رودادِ سفر سننے میں لگ گئی۔ اس دوران میں نے غور کیا کہ آپا کے چہرے پر سُرخی نمایاں ہے۔ صحت بہت اچھی ہو گئی ہے۔ سلطانہ آپا بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ دلچسپ اندازِ بیاں، اور سفر کی دشواریاں، اور منزل کی راحتیں، میوے اور چائے کے ساتھ جاری تھیں۔ پھر سلطانہ آپا نے نایاب آپا سے اُن کی صحت کے بارے میں پوچھا، نایاب آپا نے مخصوص انداز میں اطمینان کا اظہار کیا۔ سلطانہ آپا پھر میری طرف متوجہ ہوئیں "تم کچھ دُبلی لگ رہی ہو، رنگ بھی بہت کم ہو گیا ہے؟" نایاب آپا بول پڑیں کہ میری طبیعت پچھلے کچھ دنوں نارمل نہیں تھی۔ آپا نے پوچھا بھئی! تمہارے بارے میں سنا ہے کہ مضامین وغیرہ تم لکھنے

لگی ہو اور تم نے میرے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں! ایسے ہی مشق کر رہی ہوں۔ آپا خوش ہوئیں اور پرانا "سیاست" اخبار اُٹھا لائیں جس میں میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ "محفلِ خواتین کی خواتین میری نظر میں" اُنھوں نے مجھے ہی پڑھنے کو کہا۔ میں نے پڑھ کر سنایا۔ وہ خوش ہو گئیں، پھر مزید امریکہ کے حالات اور اپنے ہندوستان کی باتیں شروع ہو گئیں۔ سلطانہ آپا چاہے کہیں رہیں لیکن اُن کا دل حیدرآباد میں ہی رہتا ہے۔ بہرصورت بڑی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں، پھر کھانے کا وقت ہوا تو وہ ہمیں ڈائننگ ٹیبل پر لے آئیں، کھانے کے ساتھ ان کی باتیں بہت مزہ دے رہی تھیں۔ اس کے بعد ہم نے گھر کا جائزہ لیا، خاص طور پر میں نے آپا کا اپنا کمرہ دیکھا جو اُن کی خواب گاہ ہے، سلیقے سے سجا ہوا کمرہ اپنے مکیں کے ذوق کا غماز تھا۔ آپا کو پھول بہت پسند ہیں۔ انھوں نے پھول دار گلشن اور شوخ رنگوں کے پردوں سے گھر میں رنگوں کی دنیا بسا رکھی ہے۔ ان کی تنہائی میں اضطراب نہیں بلکہ سکون ہے۔ جس دروازے سے ہال میں آنا ہوتا ہے، وہاں سنہری دھات کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لٹک رہی ہیں۔ یہ دراصل "شاعرانہ کال بیل" ہے میں بار بار ان گھنٹیوں کو بجاتی رہی۔ مجھے یہ آواز بہت پسند ہے۔ پھر آپا ہمیں دوسرے ہال میں لے آئیں جہاں دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کو کہا گیا۔ سردی کا موسم تھا۔ رنگ برنگی بلانکٹوں سے مجھے اور نایاب آپا کو سرفراز کرتے ہوئے خود بھی ہمارے بازو لیٹ گئیں، میں ادباً بیٹھی رہی۔ نایاب آپا اور سلطانہ آپا میں اُن کی پرانی دوستوں کی باتیں ہو رہی تھیں کہ محلے کی کوئی خاتون اُن سے ملنے آگئیں۔ حسبِ عادت آپا نے اُنھیں بھی گلے لگایا اور پاس بٹھا لیا۔ میں آپا سے اجازت لے کر

ایک ضروری ٹیلی فون کرنے کے لئے اُس ہال سے باہر آگئی، پھر تقریباً پندرہ منٹ بات کرنے کے بعد میں پھر گھنٹیاں بجانے میں مصروف ہوگئی۔ آپا بڑی نفاست پسند ہیں۔ اس لئے پالتو کتّا بھی شرافت سے بیٹھا رہتا ہے۔ میں دوبارہ آپاؤں کی محفل میں آکر بیٹھ گئی۔ جانے کی اجازت مل تو گئی مگر چائے پینے کے بعد، پھر ہم سلطانہ آپا کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے لوٹ آئے۔ اُن کی محبت و خلوص سے دل و جان مہکے ہوئے تھے ؎

خوشبو کی طرح اُس نے پذیرائی کی میری



ڈاکٹر زینت ساجدہ

نایاب آپا کے ساتھ گیٹ کھول کر میں بائیں طرف سیڑھیاں چڑھتی ہوئی سوچنے لگی کہ یہ ہے ڈاکٹر زینت ساجدہ کا دولت خانہ! آگے بڑھی تو خوبصورت پھولوں اور پودوں کی بہار تھی۔ چند ہی دن پہلے صاحبِ خانہ کی آدھی شخصیت نے اس دنیائے فانی کو چھوڑا ہے جن کا نام تھا حسینی شاہد۔ ان کی آدھی ذات زینت ساجدہ صاحبہ ایک مجاہدہ کی طرح شوہر کے غم کا مقابلہ کرنے میں لگی ہیں۔ خیر ہم اندر پہنچے۔ زینت آپا بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم نے سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ میری سیدھی جانب

ساجدہ عابد بیٹھی ہوئی تھیں۔ زینت آپا نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ تمہیں میں نے کہیں دیکھا ہے ؟ میں نے لمحہ بھر کے لیے ان کے غم کو کم کرنے کے لئے کہا۔ خوابوں میں ..... زینت آپا ذرا سا مسکرائیں اور کہا 'میں نے تمہیں حقیقت میں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آتا ! نایاب آپا نے میرا تعارف کروایا۔ یہ فاطمہ تاج ہے ..... زینت آپا نے پوچھا' کیا تم وہی فاطمہ تاج ہو جن کے مضامین کا آج کل بہت ذکر چل رہا ہے ۔ میں نے انکساری سے کہا جی! ... پھر انہوں نے کہا تمہارا نام میں نے فاطمہ عالم علی کی زبانی سنا ہے۔ تمہاری بڑی تعریف کر رہی تھیں۔ میں نے کہا فاطمہ آپا کی تعریف " محبت زدہ " ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ابھی لکھنے کی کوشش میں لگی ہوں پھر زینت آپا اور نایاب آپا میں پرانے قصے چل نکلے۔ میں ساجدہ آپا سے باتوں میں لگ گئی۔ ساجدہ آپا نے بتایا کہ وہ بمبئی چلے جانے کی وجہ سے " محفلِ خواتین " میں نہیں آرہی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ پہلے پابندی سے آیا کرتی تھیں ۔ پھر اپنے لڑکے طلعت عزیز کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ انھوں نے اپنے بیٹے کی توجہ اُردو اور غزل کی طرف کرنے میں بڑی محنت کی اور کامیاب ہوئیں۔ طلعت عزیز کو اللہ نے آواز بہت اچھی دی ہے اس لئے اپنے لہجے سے غزل کو سنوار کر سناتے ہیں۔ بہرحال ساجدہ آپا بھی بڑی محبت کرنے والی ہستی نکلیں۔ اسی دوران زینت آپا کی ایک عزیز جو ان کی شاگرد بھی ہیں " عالیہ خانم " ہم سے ملنے آکر بیٹھ گئی تھیں ۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سیاست اخبار میں اکثر میری تحریریں پڑھتی ہیں۔ اس طرح تکلف جلد ختم ہوگیا۔ ذرا سی دیر میں ہم دونوں اچھے دوست بن گئے۔ عالیہ مجھے پسند آئیں۔ صورت کے ساتھ حُسنِ اخلاق سونے پہ سہاگہ لگے۔ عالیہ کے لئے ایک شعر یاد آگیا سہ

وہ سیدھا سادا سہی باوقار کتنا تھا
ہزار چہروں میں بھی پُر وقار کتنا تھا

پھر زینت آپا نے مجھ سے باتیں کیں۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں شاعری کرتی ہوں تو غزل سُنانے کا حکم دیا۔ جب کسی شوروم میں بہت ہی مالدار گاہک آتے ہیں تو دوکان دار بہت ہی بچھے بچھے سے لگتے ہیں۔ میں نے ایک غزل ان کو یوں سنائی جیسے بڑے بڑے شوروم میں سیلز مین تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کپڑوں کے تھان کے تھان سامنے ڈالتے جاتے ہیں۔ زینت آپا کو غزل بہت پسند آئی۔ پھر میری اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل پوچھی، یعنی شوہر اور بچوں کے بارے میں اور خوش ہوئیں۔ ان کے بعض سوالات سے میں ان کے دل کے ادھ کھلے دروازے میں سے اندر جھانکنے لگی جہاں مجھے ان کی مخاطبت کا انداز لے آیا تھا۔ میں نے ان کے دل کے اندر جھانکا۔ اُف! بہت ہجوم تھا۔ وہاں گردشِ دوراں کے مارے ہوئے کچھ لاغر جسم، کچھ نم آنکھیں کچھ مسکراتے ہونٹ، کچھ تشنہ لب نظریں، کچھ غم سے چھلکتی آنکھیں، کچھ ٹوٹے دلوں کی کرچیاں، کچھ خواب ادھورے سے، کچھ ارمانوں کے مارے حسرت زدہ سے لوگ، کچھ زخموں سے تازہ گلاب، کچھ مائل بہ پرواز آرزوئیں، کچھ علم و ادب کے قابلِ احترام لمحے...... تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی ان کے دل میں، لیکن زینت آپا کی مسکراتی، محبت ٹپکاتی آنکھیں مجھے اپنے دل کے اندر سما جانے کی دعوت دے رہی تھیں۔ میں چپکے سے ان کے دل میں آخر گھس پڑی۔ کتنا ہی ہجوم کیوں نہ ہو، میں تو یہیں رہوں گی۔ زینت آپا نے مجھے بلایا ہے، میں ان کا اندازِ تخاطب نظر انداز نہیں کر سکتی۔ بد نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو محبت پاش نظریں نہیں سمجھ

پاتے۔ زینت آپا کی علمی، ادبی، سرگرمیاں روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرنے میں کسی کو تامل نہیں مگر میں ان کے پیغمبری پیشہ سے ہٹ کر لکھ رہی ہوں۔ مجھے شخصیتوں کی ذات سے واسطہ ہے۔ میں انسانوں کو پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ کتابیں تو سب ہی پڑھتے ہیں، سمجھ بھی لیتے ہیں لیکن انسان، انسان کو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت نہ جانے کیوں محسوس نہیں کرتے۔ زینت آپا کے حسنِ اخلاق نے مجھے گرویدہ کر لیا ہے۔ میں تو انہیں تعزیت ادا کرنے گئی تھی لیکن انھوں نے میرے دامن میں محبت کے بہت سارے پھول ڈال دیئے ہیں۔ کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جو دوسروں کا دامن بھر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ زینت آپا کے ملیح چہرے پر میں نے اپنے لئے پیار کا بھرپور عکس دیکھا ہے۔ میں نہ ان کی شاگرد ہوں نہ قرابت دار، اس کے باوجود "پھر بھی لگتا ہے کہ برسوں کی شناسائی ہے"۔ بہرحال نہ چاہتے ہوئے بھی ہم لوگ وہاں سے لوٹ آئے۔ آتے آتے مجھے یاد آیا کہ زینت آپا نے تاکید کی کہ آتی رہو، جب کبھی ہو سکے بلا تامل چلی آنا۔ راستہ طے کرتے ہوئے مجھے یہ شعر یاد آگیا ؎

دستک نہیں دی جاتی یہاں ایسے بھی گھر ہیں
جب چاہو چلے آؤ کہ دروازہ کھلا ہے

-○-

(سیاست۔ ۲۳ر فروری ۱۹۹۲ء)



فاطمہ عالم علی خان

دنیا میں آنکھیں کھولتے کے کچھ ہی دن بعد جن کی ماؤں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوجائیں، انہیں دنیا میں سب کچھ نظر آتا ہے لیکن ماں کے قدموں تلے کی جنت دکھائی نہیں دیتی۔ باپ اور دیگر اقربا ان کی پرورش میں لگے رہتے ہیں اور کچھ قدرت اس طرح انہیں درس دیتی ہے کہ خود ان کی ذات دوسروں کو جنت کی لطافت بخشنے لگ جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی بات فاطمہ آپا میں بھی ہے۔ بے انتہا خلوص، ومحبت اور ہمدردانہ سلوک ان کی ذات کو بہت ہی نمایاں کردیتا ہے۔ علمی گھرانے کا ماحول اور بزرگوں کی بہترین تربیت نے کئی چاند لگا ڈالے ہیں۔ فاطمہ آپا میرے تجربے کے مطابق نرم و حساس دل کی مالک ہی نہیں بلکہ صدقِ دل سے اپنے ایمان پر قائم ہیں۔ میں نے کسی کی بھی برائی یا شکوہ ان سے کبھی نہیں سنا، کوئی بات ناگوار بھی گذرتی ہے تو اس کا اظہار کبھی نہیں کرتیں بلکہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاکر خاموشی اختیار کرلیتی ہیں۔ شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ حسنِ اخلاق سے ہی ہوتا ہے۔ سو فاطمہ آپا اس طرح سے کافی مالامال ہیں۔ رہی ان کی تحریر و تقریر کی بات! یادوں کے بکھرے ہوئے موتیوں کو پروکر خوبصورت سے ہار بنا کر قرطاس پر قلم سے سجا دینے میں ماہر ہیں۔ اپنے غم دوسروں کی آنکھوں سے بہا دینے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ یہ دل کی سنگلاخ چٹانوں سے احساس کے چشمے بہا کر اپنی

تقریر کے کئی گلشن مہکا دیتی ہیں۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا اندازِ بیاں
آدمی کو انسانی نقطۂ نظر کے کتنے قریب پہنچا دیتا ہے۔ آواز کی خوبی بے شک اللہ کی
دین ہے اور نرم و شیریں لہجہ سے آواز کو سجانے پر اللہ نے انہیں بہت ہی توانا رکھا
ان کا اندازِ قلم تلوار سے کم نہیں۔ جب چلتا ہے تو بڑے بڑے لکھنے
والوں سے اپنی دھار کی طاقت منوا لیتا ہے۔ یا دوں کے شہر میں سیجے ہوئے رنگ
برنگے فانوس الفاظ کی صورت میں جگمگا جاتے ہیں۔ سننے والے فاطمہ آپا کے دورِ رواں
میں اپنے آپ کو ان کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ لفظ لفظ چراغ" سطر سطر گلستاں
یہی ہے ان کے فن کا کمال" ان کو پڑھتے ہوئے ان کو سنتے ہوئے کبھی آپ کو
تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ برسوں پیچھے ہم ان کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ وہ جس
طرح بھی چاہیں سامعین و قارئین کو کسی بھی راہ سے واپس اس مقام پر لے آتی
ہیں جہاں سے وہ ساتھ لے چلی تھیں۔ اصل میں اس طرح کی قابل شخصیتوں کے بارے
میں مجھ جیسوں کو کچھ کہنے یا لکھنے سے گریز کرنا چاہیئے لیکن اب اس کو کیا کیا جائے
کہ مجھے انسانوں کو پڑھنے کا شوق ہے۔ خاص طور پر" محفلِ خواتین" سے متعلق ہر
خاتون پر میری نظر رہتی ہے اور محفلِ خواتین کی جانِ محفل یہی فاطمہ بنت قاضی
عبدالغفار ہیں۔ ڈنکے بجانے کا رواج اگر باقی ہوتا تو یقیناً ڈنکے کی چوٹ بھی
فاطمہ، فاطمہ کہہ کر گونجنے لگتی۔ یہ صرف میرا نظریہ ہے، مجھے کسی کے اتفاق یا
اختلاف سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ میں جو کچھ بھی محسوس کرتی ہوں، ذاتی طور پر
محسوس کرتی ہوں اور بغیر کسی لحاظ کے قلمبند کرلیتی ہوں۔ ظاہر ہے کہ "فی البدیہہ"
تحریر میں ادھورا پن کسی حد تک باقی رہ جاتا ہے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی بھی

ہوتی ہیں کہ ان کے بارے میں کتنا ہی بولئے کتنا ہی لکھئے جی نہیں بھرتا۔ ان کو ہی سنتے اور پڑھتے میں عمر گذار دینے کو جی چاہتا ہے۔

انسانی فطرت کے عین مطابق فاطمہ آپا میں بھی مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے لیکن اتنا شائستہ کہ اس پر بھی متانت کا گماں ہونے لگتا ہے۔ ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ کے ہار پہناتے ہوئے فاطمہ آپا قہقہوں کا ایک شاندار گلدستہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسکرایئے .... مسکراتے رہیئے .... بالکل میری طرح ....!

بہرحال میری فاطمہ آپا سے قربت زندگی کے اچھے تجربوں میں شامل نہیں ہوتی تو زندگی بے مزہ لگتی۔ ان سے ملاقات کا ہر لمحہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ ان کے اندازِ تکلم کا سحر مجھ پر بھی ہمیشہ طاری رہتا ہے ؎

مجھ ہی کو تنگیٔ دامن پہ ہے پشیمانی
بہت سے پھول کھلے ہیں تری نگاہوں میں

(سیاست ۱۹۹۲ء)



نایاب سلطانہ

نایاب سلطانہ ممتاز شاعرہ ہیں، یہ سب جانتے ہیں لیکن میں نے جہاں تک انھیں محسوس کیا اُس کا خلاصہ یوں ہے کہ محفلِ خواتین میں میرا اُن سے تعارف کروایا گیا تو بڑے خلوص سے جواب ملا۔ اُن کا انداز بظاہر بہت سخت گیر نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بڑی غصہ والی خاتون ہوں۔ لیکن میں جب بھی اُن سے ملی ہوں مجھے اپنی رائے بے بنیاد نظر آئی، مجھ سے اُن کا خلوص اور مشفقانہ رویہ نئی بات نہیں، ان کا رعب دار لہجہ مجھے خوف کا احساس نہیں دلاتا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ ایک دوست کی طرح ملیں، نہایت نرم دل ہیں اور کسی کو مایوس نہیں ہونے دیتیں خلوص و محبت کے اس پیکر سے میں بہت متاثر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان سے مل کر دلی سکون محسوس کرتی ہوں۔ نایاب آپا اپنے اطراف اصولوں کا حصار رکھتی ہیں، کسی کی مجال نہیں جو پار کر جائے، میرے لئے کوئی پابندی نہیں، میرے لئے ان کا "درِ محبت" ہمیشہ ہی "وا" رہتا ہے۔ اپنی ہر نئی غزل بھی انہیں سُنا کر داد لیتی رہتی ہوں۔ نئے نئے افسانے سُنا کر انھیں متاثر کرنے کی کوشش بھی کرتی ہوں، کبھی مزاحیہ چیزیں سُنا کر انھیں بے اختیار ہنسا دیتی ہوں۔ نایاب آپا سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، ماحول کا گرد و غبار احساس کے آئینے پر جب بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور خود اپنا عکس دھندلانے لگتا ہے تو میں نایاب آپا سے فون

پر بات کر لیتی ہوں یا کبھی اُن کو اپنے پاس بُلا لیتی ہوں، نایاب آپا کہیں آنے جانے کی قائل نہیں مگر میرے پاس اپنی بے انتہا معروفیت کے باوجود میری خوشی کے لئے آجاتی ہیں اور اپنی پُرخلوص باتوں سے دل کی اُداسی دور کر دیتی ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہ ہو تو وہ فکرمند ہو جاتی ہیں۔ میں اُن سے جو بھی مشورہ کروں، انتہائی دیانت داری سے مشورہ دیتی ہیں، میں جو بھی اُن کو سناؤں، توجہ سے سنتی ہیں اور اپنے اظہارِ خیال میں ذرا بھی تامّل نہیں کرتیں۔ وہ دوسروں کے لئے لاکھ سنجیدہ سہی لیکن میرے لئے زندہ دل، فراخ دل دوست ثابت ہوئیں۔ ان کی بے لوث محبت کی چارہ گری کا جواب نہیں۔ ؎

اُس کو یہ اطمینان کہ زخمی نہیں ہوں میں
مجھ کو یہ ہے گُمان، مرا چارہ گر تو ہے



* انسان تمام جذبوں پر قابو پا سکتا ہے لیکن انتقام وہ جذبہ ہے جو انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، بینائی کے باوجود کچھ نہیں نظر آتا، تیر چلاتے وقت نہیں دیکھا جاتا کہ آگے اندھیرا ہے یا اُجالا ہے، اِس میں شک نہیں کبھی نشانہ خطا بھی ہو جاتا ہے لیکن کبھی نشانہ خطا نہیں بھی ہوتا ہے، ہے نا ــــ؟



آمنہ ڈاکٹر حیدر خاں

بزمِ خواتین، محفلِ خواتین اور ویمنس ویلفیر اسوسی ایشن سے وابستہ یہ نام محتاجِ تعارف نہیں۔ مجھے ان کا جذبۂ خدمتِ خلق اور ملنسار طبیعت نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ ان کے حُسنِ سلوک سے میں بے حد متاثر ہوں۔ جب بھی میرا ان کا سامنا ہوتا ہے، بار بار میرے اور بچوں کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ خوشی کا اظہار لفظوں سے ہی نہیں چہرے سے بھی عیاں ہوتا ہے۔ آنکھوں کی روشنی بتاتی ہے کہ اندھیرے گوشے نظر سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ زندگی کی دشواریوں سے گذرنے والی لڑکیوں اور خواتین کے مسائل سے انھیں بہت دلچسپی ہے اور وہ شخصی دلچسپی لیتی ہوئی مجبور وبے بس خواتین کی مدد کرتی ہیں۔ میں جب ان کی تقریروں، تحریروں کے بارے میں غور کرتی ہوں تو سوچتی ہوں، ان کا دل بہت درد مند ہے، ان کی حسّاس وبااخلاق طبیعت اور مجھ سے والہانہ محبت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اچھے لوگ تو اچھے ہی ہوتے ہیں لیکن جو ہم سے محبت کرتا ہے وہ اور بھی اچھا لگتا ہے۔ یعنی کہ "دو آتشہ" ہے نا ؟

--



قادری بیگم

فکر کے دریا دل کو کوزے میں بند رکھنے والی اس معزز خاتون کو قادری بیگم کہتے ہیں۔ جی ہاں! وہی قادری بیگم جو کبھی ویمنس کالج کی پرنسپل ہوا کرتی تھیں۔ ان کے شاگردوں کے کارواں میں، میں شامل نہیں، لیکن میں ان سے پہلی بار اُس وقت ملی، جب میری شاعری کا مجموعہ "اب کے برس" کی رسم اجراء کی تقریب کے موقع پر انھیں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بُلایا گیا تھا۔ میری کتاب "اب کے برس" کا مطالعہ کرنے کے بعد جو انھوں نے تقریر کی، وہ اِس قدر پُراثر چونکا دینے والی تھی کہ ہر ایک کی زبان سے واہ واہ ہونے لگی۔ میرے لئے یہ پہلا موقع تھا جو میں قادری آپا کو سُن رہی تھی اور وہ بھی خود اپنے بارے میں۔ اپنی دھواں دھار تقریر میں قادری آپا نے میرے کلام کا بغور جائزہ لے لیا تھا۔ مراسم نہ ہونے کے یا وجود کسی کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن قادری آپا کو بولنے پر اتنا قابو ہے جیسے ملاّحوں کو ٹوٹی کشتی پار لگانے پر ملکہ حاصل ہوتا ہے قادری آپا جس موضوع پر چاہیں کہہ سکتی ہیں، ان کی تقریر کا سکّہ رائج الوقت ہے، تھکتی ذرا بھی نہیں، اُسکے بعد سے قادری آپا سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ انتہائی محبت سے مخاطب کرتی ہیں اور مجھے ادبی معاملوں میں قیمتی مشوروں سے نوازتی رہتی ہیں۔ یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہ آسکی کہ وہ مجھے زیادہ چاہتی ہیں یا میں اُنہیں .... ؟ --

انیس فاطمہ ڈاکٹر حسن الدین احمد

محترمہ بیگم انیس حسن الدین احمد صاحبہ کے بارے میں زیادہ تو نہ کہہ سکوں گی، کیونکہ میں ان سے بھی پہلی بار "اب کے برس" کی رسم اجراء تقریب کے موقع پر ملی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ میری تحریریں "سیاست" میں پڑھتی رہتی ہیں اور اُن کے ذہن میں میرا جو خاکہ بنا ہے وہ زیادہ مختلف نہیں۔ انتہائی اپنے پن سے پیش آتی ہیں، جب جب بھی ملنا ہوتا ہے، پُرخلوص مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے گلے لگالیتی ہیں۔ میری شاعری انیس آپا کو بہت پسند ہے۔ جب بھی اُنہوں نے مجھے سنا ہے، نہ صرف پسند کیا بلکہ بہت معتبر طریقہ سے داد دیتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ مجھے بس ایسے ہی لوگ پسند ہیں جو بظاہر اپنے نہ ہوکر بھی اپنے لگتے ہیں، جیسے ہم ہمیشہ ساتھ رہتے ہوں۔ میں انیس آپا کو دور سے پہچان لیتی ہوں، سادگی کا پیکر، مجسم خلوص انیس آپا ہی ہوسکتی ہیں نا......؟

--



بیگم جسٹس سردار علی خاں

(افضل آپا)

مراسم پرانے تو نہیں، لیکن دوستی کے ابتدائی مرحلے کچھ اتنی تیزی سے طے ہوئے کہ میں حیران رہ گئی۔ مجھے تو صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ "بیگم جسٹس سردار علی خاں" ہیں۔ وہ جب ایک مشاورتی اجلاس کی صدارت کر رہی تھیں، میں نے ان کی شخصیت پر گہری نظر ڈالی، چہرہ نیا لگا، لیکن انداز پرانے تھے۔ جن میں وضعداری، لحاظ، انکساری، سادگی، اخلاق و اخلاص سب ہی کچھ تھا، اس طرح کے لوگ ہی تو تہذیب کا ورثہ ہوتے ہیں نا! میں نے اجنبیت کی دیوار گرانے کیلئے پہلا قدم اُٹھایا، یعنی کہ اپنی کتاب "اب کے برس" ان کی خدمت میں تحفتاً پیش کر دی، جسے بڑے خلوص کے ساتھ قبول کر لیا گیا، دوسری ملاقات بھی تقریباً اسی طرح ہوئی۔ اب میرے پاس پیش کرنے کے لئے دوسری کتاب تو تھی نہیں، اس لئے سلام اور مسکراہٹ پر ہی اکتفا کر لیا، پھر وہ رفتہ رفتہ میری طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہوئیں، اور بس! پھر یہاں سے افضل آپا کی ملنسار طبیعت کی چھاؤں میں، میں آگے بڑھتی گئی۔ بقول شاعر ؎

کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے ....

مختلف اوقات میں ٹیلی فون پر کبھی کبھی کی گفتگو اور ملاقاتوں کے سلسلے

نے قرطاسِ دل پر لکھے کچھ اہم ناموں میں اس نام کو بھی کندہ کر دیا، افضل آپا نہ صرف پیکرِ خلوص و محبت ہیں بلکہ زندہ دل بھی ہیں، باوقار مسکراہٹ ہمیشہ ان کے چہرے پر سجی رہتی ہے۔ میں کتنی ہی دور کیوں نہ بیٹھوں، افضل آپا کی متلاشی نظر مجھ تک پہنچ ہی جاتی ہے اور ہم باقاعدہ مسکراہٹوں کی ترسیل میں لگ جاتے ہیں۔

افضل آپا اپنی ہمدردانہ طبیعت سے پورا انصاف کرتی ہیں یعنی سب ہی ملنے والوں کی خیریت پوچھنے کا پُرخلوص انداز متاثر کرتا ہے۔ پرانی تہذیب کی علمبردار، قابل خاتون کی شخصیت بہت نمایاں اور باوقار ہے۔ تقریر و تحریر دونوں بائیں، دائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔ لہجے میں اپنائیت ہے، میری طرح کوئی اجنبی اگر افضل آپا سے ملے تو یقیناً سوچ میں پڑ جائے کہ "یہ کوئی اپنا تو نہیں"؟ ....؟ ....؟

قارئین نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے کہ میں جب بھی لکھتی ہوں اہم شخصیتوں پر بے جھجک کیا کیا لکھ دیتی ہوں، یہ صرف میرے احساسات ہیں جو میں قلم بند کرتی رہتی ہوں اس لئے ناراضگی کا کبھی کوئی پہلو نکلتا ہی نہیں ؎

خوش نظر ہوں اس لئے رہتی ہے ہیروں پر نظر
پتھروں سے اپنا گھر بھرنا نہیں آتا مجھے

٭٭٭



صالحہ الطاف

پتہ نہیں ہم زندگی کے کس موڑ پر ملے اور کب ملے، پھر کس موڑ پر بچھڑ گئے لیکن یہ احساس ہمیشہ میرے ساتھ رہا جیسے کہ صالحہ آپا بھی اسی ڈائننگ ٹیبل پر سلیقے سے کھانا کھا رہی ہیں جہاں میں بیٹھی بے تکلف، پوری توجہ سے اپنی بھوک مٹانے پر تلی ہوں۔ کبھی یوں بھی محسوس ہوا جیسے کہ ہار سنگھار کی اس بیل کے پیچھے میں بھی آنکھیں بند کئے سہانی شام کا لطف لے رہی ہوں جہاں صالحہ آپا ڈرامے لکھنے میں مصروف ہیں۔ کبھی ایسا بھی لگا کہ بڑے سے دالان کے ایک گوشے میں، میں ہوں اور دوسری طرف صالحہ آپا بیٹھی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہیں، جیسے کہ انہوں نے ارادہ بھانپ لیا ہو کہ میں اب کچھ ہی دیر میں کسی نہ کسی شاعر کی نقل کرتے ہوئے ناقابل برداشت ترنم میں غزل سنانے ہی والی ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ بظاہر کوئی وجود نہیں ہوتا لیکن کسی کی ذات یاد بن کر ہم میں سما جاتی ہے اور ہم اس ہستی کو اپنی ہی طرح محسوس کرنے لگتے ہیں۔ برسوں بعد صالحہ آپا کی ترنم ریز آواز نے سماعت پر پڑی وہ بلوریں چلمن سرکا دی جس کے ہٹتے ہی مجھے نغمگی کا احساس ہوا، ان کی آواز کے سحر نے کچھ ایسا اثر کیا کہ ان کی آواز میری سماعت ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ مدت کے بعد صالحہ آپا کی لطیف و پُرکیف آواز سنی، وہی دلکش لہجہ، وہی نرم سے جملے وہی شائستہ الفاظ، وہی آواز سُریلی۔ آبشاروں سے جب پانی کے قطرے کہیں

دُور شہر سے مل کر چٹانوں سے گذرنے لگتے ہیں تو قدرت کے موسیقی نواز پہلو تو دل، اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔ بعض لوگوں کے انداز میں موسیقی کا کچھ ایسا سحر ہوتا ہے جو نہ روی شنکر کے ستار میں ہے، نہ ہری پرساد چورسیہ کی بانسری میں، نہ بسم اللہ خاں کی شہنائی میں۔ آواز کے سُر تال تو لب و لہجہ سے مل کر مقابل کو مسحور کرتے ہیں، آواز کی دلکشی سراپے کے تصور کو تصور میں اور حسین بنا دیتی ہے۔ ہے نا؟

صالحہ آپا کے فون نے اچانک مجھے چونکا دیا۔ برسوں پیچھے میں ایک پل میں پہنچ گئی۔ اُنہوں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے مجھے یاد دلایا کہ میں ابھی تک ان کی یادداشت میں باقی ہوں۔ میرا عکس تو مدھم ہی لیکن اُن کے ذہن کے گوشے میں ہے ضرور۔۔۔۔

میں نہ جانے کتنی دیر تک صالحہ آپا کی آواز کے آبشاروں میں بھیگتی رہی اور بھی شاید یہ سلسلہ دراز ہوتا مگر ٹیلی فون لائن میں آج کل کسی طرح کی شائد وبا، پھیلی ہوئی ہے، جو بات ختم ہونے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ خیر! میں نے انہیں دوبارہ فون کیا۔ آپا کی ترنم ریز آواز کی رہبری میں بہترین خیالوں اور لفظوں کا کارواں چل پڑا۔ کچھ مذہبی اوراق پر سرسری نظر ڈالی۔ معاشرہ کے زخم گن ڈالے۔ کچھ کہی کچھ سنی، مزہ آگیا، میں بے حد خوش ہو گئی ہوں اُن سے بات کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موسمِ گل کا پیغام دینے والی ہواؤں نے سرگوشیاں کرتے کرتے ایک دم ہی روح کے چمن میں بہت سے پھول کھلا دئیے ہوں۔

احساسِ تشنہ کامی یہ کم گفتگو سہی
اچھا ہوا کہ آپ سے اک سلسلہ تو ہے

پھر آپا سے ایک تقریب میں کئی برس بعد ملاقات ہوئی۔ کافی تبدیلیوں کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے مل کر خوشی محسوس کر رہے تھے حالانکہ اس خوشی کے احساس کے درمیان الفاظ نہیں تھے، اس کے باوجود خوشی کا اظہار تھا۔ پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا، وہی میٹھا میٹھا لہجہ جس کی حلاوت سے زندگی مزیدار لگتی ہے۔ وہی نرم نرم لہجہ جیسے ابھی ابھی کھلے ہوئے دوپہرے گلاب کی پنکھڑیاں وہی نپے تلے الفاظ جیسے کہ سونا، چاندی کا صحیح وزن بتانے والی میزان، منکسر المزاج ہونے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ جیسے شاہانہ طبیعت ہو اُن کی۔

خواتینِ دکن کے ذوق کے لئے انہوں نے ایک ادبی رسالہ خاتونِ دکن کے نام سے شائع کروایا تھا جو اُن کے بیرونِ ملک سفر کی وجہ سے کافی عرصہ تک جاری رہنے کے بعد بند کر دینا پڑا۔ جس میں حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان اور بیرونِ ملک کے ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ بات پرانی ضرور ہے، اس کے باوجود اب بھی خاتونِ دکن کو لوگ بھولے نہیں کسی بھی طرح کا کوئی دور ختم ہو جاتا ہے تو تاریخ بن جاتا ہے اور تاریخ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ہے نا ــــ ؟

-۲-

(سیاست ۱۹۹۲ء)



ڈاکٹر ناصرہ خانم

دودھ سے بھگوئے میدہ سے بنی ان شفاف خاتون کو میں نے پہلی بار "محفلِ خواتین" میں کرسیٔ صدارت پر دیکھا، اُسی دن میں نے بھی اپنا ایک افسانہ "شعلوں کے درمیاں" سُنایا تھا۔ وہ ہر ایک لفظ کو دھیان سے سُن رہی تھیں۔ تقریباً سبھی خواتین کی تخلیقات کو انھوں نے غور سے سنا اور صدارتی تقریر میں سبھی کی بہتر طریقے پر حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میرے افسانے کو بھی بہت پسند کیا۔ ویسے بااخلاق ملنسار طبیعت کی مالک ہیں، ان کی سادگی ہر دلعزیز ہے، میں نے جب بھی انھیں دیکھا تو جبیں پر تکبّر کی لکیریں کبھی نظر نہ آئیں، ہمیشہ انکساری کا چڑھتا سورج ہی چہرے پر دمکتا نظر آیا۔ محترمہ ناصرہ خانم ان خواتین میں سے ہیں جن سے مل کر واقعی خوشی ہوتی ہے۔ میں نے اُنہیں دوسری دفعہ ویمنس اسوسی ایشن کی جانب سے منائے جانے والے جشنِ چار سو سالہ کے سلسلے کے ایک سمپوزیم میں جو اُردو گھر میں منعقد کیا گیا، دیکھا تھا، اُنھوں نے حیدرآبادی خاتون ادیب اور شاعرات پر بہت ہی معلوماتی مقالہ پڑھا تھا، کئی کتابوں کے حوالے دیتے ماضی کی گذرگاہوں سے ہوتے ہوئے اُن اہلِ قلم خواتین کا ذکر جو اس دنیا میں اب نہیں لیکن ان کے کارنامے تاریخ بن چکے ہیں۔ پھر آگے بڑھتے بڑھتے وہ آج کے دور کی اہلِ قلم خواتین کے نام بتاتی رہیں، میں اُس وقت اُچھل پڑی جب خود میں نے اُن سے سنا اپنا بھی نام سُنا، مجھے اُسوقت انکی تحقیقی سرگرمیوں کا احساس ہوا۔ واقعی یہ مقالہ بہت ہی جامع تھا جو انہوں نے مجھ جیسی خواتین کا نام بھی کھوج کر کے تاریخ کے صفحات پر اپنی قابلیت کی روشنائی سے لکھ دیا تھا، یہ بہت اہم کارنامہ ہی ہوا نا ۔ ۔ ۔ ؟

ڈاکٹر سلطانہ خاں

۴ر جون ۱۹۹۲ء مدینہ ایجوکیشن سنٹر میں خواتین کے مسائل سے متعلق ایک سیمینار، خواتین کی ہی نگرانی میں منعقد ہوا۔ اسی سیمینار میں مجھے محترمہ سلطانہ شرف الدین نے ڈاکٹر سلطانہ خاں سے متعارف کروایا کہ "یہ فاطمہ تاج ہے، میری شاگرد . . . "۔ "اوہ! فاطمہ تاج تم ہو، مجھے تم سے ملنے کی بے حد خواہش تھی۔" ڈاکٹر سلطانہ خاں نے یہ کہتے ہوئے میرا بازو تھام لیا۔ "تمہارے مضامین میں سیاست میں پڑھتی رہتی ہوں۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر سلطانہ خاں کے چہرے نے مجھ پر محبت کی وہ کرنیں برسائیں، وہ کرنیں برسائیں کہ میری روح تک جگمگا گئی۔ کچھ لوگوں کی شخصیتیں ایک ہی نظر میں ہمیں متاثر کر جاتی ہیں۔ اور میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں "شکریہ" جیسے گھسے پٹے لفظ کو ایک بار ادا کرکے چپ سی ہوگئی۔ مجھے لگا کہ لہجہ کی سادگی ظاہر و باطن ایک ہونے کا مظہر ہے اور بس . . . . میں بھی ڈاکٹر سلطانہ خاں کے پرستاروں میں شامل ہوگئی

ویسے ان کی مسیحائی کے چرچے بہت ہیں۔ اُن کے پاس دل کی بڑی اہمیت ہے، دیکھئے نا! کہ ہوا یوں، میں نے اپنی لڑکی اسماء کی شادی پر انھیں مدعو کیا تھا، لیکن کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد مایوس ہوگئی کہ شائد وہ نہ آسکیں گی کیونکہ ڈاکٹروں کی دنیا الگ ہوتی ہے نا؟ لیکن

کچھ ہی دیر بعد مجھ پر خوشی کے اُجالے برس پڑے۔ میرے سامنے ڈاکٹر سلطانہ خاں مسکراتی ہوئی کھڑی تھیں اور مبارکباد دے رہی تھیں۔ اتنی مصروفیت کے باوجود میری خوشی میں شریک ہونا ان کی محبت کا ضامن تھا۔

یہ بہت اچھی مقرر ہیں جو دلائل پیش کرتی ہیں بالکل حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں، ان کا ذوقِ ادب کافی معیاری ہے۔ خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے۔

بہرحال! میں خوش ہوں اسلئے وہ میرا چارہ ساز ہے.....!



* کسی پر تنقید یا کسی کی تعریف کوئی بڑی بات نہیں، خوبی تو یہ ہے کہ کسی کو سمجھا جائے، ہر اعتبار سے سمجھا جائے، یہی وہ مشکل کام ہے جو بہت ہی کم لوگ کر سکتے ہیں۔



▪ "پرندے بھوکے مرجاتے ہیں مگر گھانس نہیں کھاتے۔"



آر۔ بانو

چہرے پر نظر پڑتے ہی یقیں سا ہو جاتا ہے کہ ان کا نام رحیمہ بانو ہی ہوگا انہوں نے اپنی شخصیت کو نام کے مغربی انداز میں چھپانے کی کوشش تو بہت کی مگر چہرے سے ٹپکتی منکسر المزاجی کے علاوہ طرزِ عمل اور رویّہ سے جھلکتی اخلاق کی شعاعوں کو چھپانے میں قطعی ناکام رہیں۔ ویسے بھی مشرق کی مُہر ان مٹ ہی ہوتی ہے نا؟ ان سے کوئی اس طرح مرعوب نہیں ہوتا کہ کم گفتگو یا رسمی کلام پر اکتفا کر لیا جائے، ان کا ہر ایک سے مشفقانہ و مخلصانہ برتاؤ ضمانت دیتا ہے اس بات کی کہ وہ ایک بے حد ملنسار، وضعدار طبیعت کی مالک ہیں۔ بہ حیثیتِ معلّم ان کا رعب نمایاں ہونے کے باوجود مشفقانہ انداز کا اثر بہت زیادہ ہے۔

ان کا شمار اُن مثالی خاتون اساتذہ میں ہے جو اولیں درس، اخلاق کا دیتی ہیں، نہ صرف درس دیتی ہیں بلکہ اپنی باعمل زندگی کی مستقل مثال قائم کرتے ہوئے دلوں میں خاص مقام بنالیتی ہیں۔ محترمہ آر، بانو صاحبہ بے پناہ قابلیت کے علاوہ غضب کا حافظہ رکھتی ہیں، ان کی انفرادی شخصیت جہاں ہم میں ان سے قریب ہونے کی خواہش پیدا کرتی ہے وہیں ان کا پُر خلوص طرزِ کلام ہماری خواہش سے بھرپور تعاون کرتے ہوئے ہمیں ان کے اتنے قریب کر دیتا ہے کہ ہم ان کی ذات کے سمندر کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں جہاں محبت کے آبدار موتی ان کی ذات کے صدف سے

جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔

محترمہ آر بانو صاحبہ کی شخصیت سے میں اس لئے بھی زیادہ متاثر ہوں کہ مجھے بھی ان کی " نگاہ میں آنے کا " شرف حاصل ہے، محترمہ آر بانو صاحبہ کا پہلی ملاقات سے ہی میرے ساتھ برتاؤ بہت ہی مشفقانہ و مخلصانہ رہا ہے۔ مجھے وقتاً فوقتاً تہنیتی اشعار اور غزلیں اعزاز کے طور پر دیتی رہتی ہیں۔ میرے بیٹے پر انھوں نے ایک ایسی نظم بھی لکھی ہے جسے سننے کے بعد خواہ مخواہ شان کرنے کو جی چاہتا ہے، ویسے شاعری میں مبالغہ آرائی تو ہوتی ہی ہے نا! ــــ بظاہر بڑی سنجیدہ نظر آتی ہیں لیکن اپنی بذلہ سنجی و زندہ دلی بات سے محفل کو ہمیشہ گرمائے رکھتی ہیں۔ انہیں اردو اور فارسی دونوں پر عبور حاصل ہے۔ پیشہ تدریس سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی بے پناہ مصروفیت کے باوجود بہترین شاعرہ و مضمون نگار بھی ہیں۔ آر۔ بانو صاحبہ کی نظر کافی گہری ہے۔ شخصیتوں کا بھرپور جائزہ وہ پل بھر میں لے لیتی ہیں اور اتنی تفصیل سے لیتی ہیں جیسے آثارِ قدیمہ کے ماہرین کھدائی میں پائی جانے والی چیزوں کا جائزہ لے کر ان کی عمر اور قیمتی خوبیاں بتا دیتے ہیں۔ دورِ قدیم کی کتنی داستانیں اب بھی ان کے حافظے میں پوری آب و تاب کے ساتھ محفوظ ہیں۔ بہت سے لوگوں میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں لیکن ہر دلعزیز ہونا سب کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ اللہ سے دعا ہے کہ محترمہ آر بانو کی شخصیت کا گلشن سدا بہار رہے ؎

"کہ جس کی خوشبو سے ہر لمحہ اب مہکتا ہے"



بیگم نواب اقبال علی خاں

اُفق کے پار ابھی تک نگاہ جاتی ہے ۔ وہی نگاہ کا عالم ہے کیا کیا جائے

بیگم نواب اقبال علی خاں کو میں "بھابی" کہتی ہوں، اور درمیان میں ہماری ذمہ دارانہ مصروفیتوں کا فاصلہ "اُفق کے پار" کی طرح ہے، پھر بھی باتوں کا سلسلہ کبھی رُکتا نہیں، ملاقاتیں کم ہوتی ہیں مگر ان کا تاثر اتنا شدید ہوتا ہے، اتنا شدید ہوتا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے سے برسوں نہ بھی ملیں تو فرق پڑنے والا نہیں ۔ ۔ ۔

بھابی کا نام رضیہ سلطانہ ہے نا ! اسی لئے میرے اور ان کے درمیان والا دھاگہ اُس رسّی سے بھی زیادہ مضبوط ہے جو ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے کے لئے کئی ٹیمیں ابھی تک استعمال کرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ! بھابی کا اندازِ گفتگو محتاط تو ہوتا ہے مگر پیار سے درمیان تکلف ذرا بھی نہیں بھابی ادبی ذوق بھی رکھتی ہیں۔ ان میں "خاتونِ خانہ" کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں ۔ "ہر کس و ناکس" کے آگے بھابی کبھی گھانس تو کیا "خس و خاشاک" بھی نہیں ڈالتیں، یہ الگ بات ہے کہ میرے لئے اُن کے پاس محبت کے انمول موتی بہت ہیں اور جن کی میں ہمیشہ قدر کرتی ہوں۔ نواب دوست محمد خاں جاگیردار کی صاحبزادی ہیں نا ! اس لئے انکے رویہ میں قدامت پسندی، سمجھداری کے ساتھ پائی جاتی ہے ۔ تہذیب، اور وضعداری ان کے مزاج میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی ہے ۔ عام خیال یہ ہے کہ بیگم اقبال علی خاں بہت کم گو خاتون ہیں ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میری اور بھابی کی صرف ٹیلیفون پر گفتگو ایک گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ! بھابی کے نام کسی شاعر کے اس شعر پہ یہ تحریر ختم کرتی ہوں کہ ؎

وہی اندازِ دل داری، وہی مسلک، وہی لہجہ ۔ نہ آیا فرق اب تک بھی تمہاری وضعداری میں

--

مُظفّر النساء نازؔ

آخر میں "حریم نازؔ" تک پہنچ ہی گئی ....

محفلِ خواتین میں اجنبی خواتین سے ملتے وقت ذرا دیر کے لئے تکلف محسوس تو ہوتا ہے لیکن یہ اثر دیر پا نہیں رہتا اور یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا، ہر ماہ منزل بہ منزل بے تکلفی سے ملاقاتوں کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم آخر دوستی کے اُس مقام پر آگئے جہاں اعتبار کے سوا کچھ نہیں ہوتا، شریکِ معتمد "محفلِ خواتین" مظفر النساء نازؔ اصل میں بڑی با اخلاق پُر خلوص و دلکش شخصیت کی مالک ہیں، روانی سے گفتگو کرنا ان کی عادت ہے۔ آنکھیں جھکا جھکا کر بظاہر انجان لیکن ہر ایک کا غور سے مشاہدہ کرنا ان کی فطرت ہے۔ میں جب ان سے پہلی بار ملی تھی تب ہی میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ "ستارے ہیں کچھ، نظر آتے ہیں کچھ" یعنی یہ سنجیدگی اور کم گوئی دراصل شوخیٔ فطرت کا وہ نقاب ہے جو شخصیت کو "معتبر" بنانے میں کام آتا ہے، میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ فطری بھولے پن نے ان کی جاذبیت میں کافی اضافہ کر رکھا ہے۔ کبھی کبھی لوگوں پر رعب ڈالنے کے لئے خوش مزاج ہونے کے باوجود سنجیدہ رہنے کی عادت سے ان کی شخصیت کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

ایک عرصہ سے نازؔ کی خواہش تھی کہ میں ان کے گھر آؤں، لیکن اتفاقاً ایسا نہ ہو سکا آخر محترمہ خود ہی ایک دن اپنی کار لے کر آدھمکیں، "نیکی اور پوچھ پوچھ" مجھے

اعتراض تو تھا ہی نہیں بلکہ خواہش تھی کہ اس شاعرہ کی قیام گاہ میں بھی دیکھوں جس کی بھیگی پلکوں نے مجھے متاثر کر رکھا ہے، خیر! تو میں "حریم ناز" تک پہنچ ہی گئی، گیٹ کھول کر بائیں طرف میں ناز کے پیچھے ناز کے ساتھ اُوپر گئی تو دیکھا بڑے سلیقے سے سجا ہوا مختصر سا فلیٹ نما "بنگلہ" ناز کی نفاست پسندی کی داد دے رہا تھا، دیوار پر لگے خوبصورت طغرے اور حسین پینٹنگ سے اُس کا باذوق ہونا ظاہر تھا ۔

جو بھی آتا ہے یہاں لوٹ کے جاتا ہی نہیں
کون سے شہر کی مٹّی ہے صنم خانوں کی

ناز نے بڑی اپنائیت کے ساتھ مجھے سارا گھر دکھایا اور "کچن" بھی جہاں مزیدار کھانوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ نیچے اُتر کر ذرا آگے اپنے اسکول کی بلڈنگ بھی دکھانے کے لئے چل پڑیں۔ آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی فکر ہی نہیں کی بلکہ اسکول قائم کر کے نازؔ نے عملی قدم بھی اُٹھایا ہے۔ پھر ہم دوبارہ بنگلہ میں آ گئے۔ کچھ شعر و ادب سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ وہی سادہ لوح طبیعت کی سادہ سی پُرخلوص باتیں، جنھیں "مصلحتوں" سے واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ میں سوچنے لگی آخر ہم ایک ہی گھرانے میں کیوں پیدا نہیں ہوئے؟ کیوں ایک ہی آنگن میں لگے ایک جھولے کے لئے ہم میں جھگڑا نہ ہو سکا۔ کیوں ہم میں صلح کروانے والے ایک ہی ماں باپ نہ ہوئے ؟ اُف! یہ نصیب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کھانے کا دور ہوا۔ مزیدار کھانے کھاتے ہوئے لگا کہ یہ ذائقہ میرے لئے نیا نہیں، اِن کھانوں میں وہی ذائقہ ہے جو میرے پکائے ہوئے کھانوں میں ہوتا ہے۔ اضافہ صرف نازؔ

کی پُرخلوص دوستی کا تھا جس کے بارے میں لکھا نہیں جا سکتا، صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو محبت کو سمجھتے ہیں۔ نازؔ سے دوستی پر مجھے بھی ناز ہونے لگا ہے۔ ملنسار نازؔ نے مجھے محبت سے اتنا سرفراز کیا ہے، اتنا سرفراز کیا ہے کہ خواہش ہوتی ہے کاش! یہ زمانہ گذرے ہوئے ماہ وسال لوٹا دے جہاں میرا اور نازؔ کا بچپن ساتھ ساتھ ایک ہی گھر کے آنگن میں پروان چڑھے جہاں آم کے درخت پر لگے جھولے پر ہم دونوں ایک ساتھ ملہار گا گا کر موسم کا لطف لیتے رہیں۔ نازؔ بے چاری نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی، میں اپنے خیالوں میں گم کبھی نہ پوری ہو سکنے والی ان خواہشوں کی شکایت اللہ میاں سے کئے جا رہی تھی ...... !

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں اور چائے ہوئی، پھر جانے کا وقت ہوا تو نازؔ نے میزبانی کا آخری فریضہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ انجام دیا یعنی اپنی کار میں ہی وہ مجھے اپنے گھر تک پہنچا گئی۔

اَب بھی میرے تصور میں "حریمِ ناز" ہے ؎

فردوس بہ داماں سہی یہ سارے محلّے
کب تیری گلی چھوڑ کے جانے کے لئے ہے

اقبال جہاں قدیر

اقبال جہاں قدیر کے بارے میں زیادہ تفصیلات میرے پاس نہیں ہیں۔ میرے پاس ان کے خلوص و محبت کا ذخیرہ بہت ہے۔ چند سال پہلے کی اتفاقی ملاقات نے مستقل دوستی کے رشتے میں اس طرح باندھا ہے جیسے "پھول والے" کھلے ہوئے پھولوں کو دھاگے میں باندھ کر گجرے بناتے ہیں۔

طبیعت کسی سے مل جائے تو بیگانگی باقی نہیں رہتی، اجنبی ہو کر بھی بہت سے لوگ اجنبی نہیں رہتے، انکی بے لوث چاہتیں، قدم قدم پر مخلصانہ مشورے اور بار بار کی مزاج پرسی تمام فاصلوں کو گھٹا دیتی ہے جیسے وجود اور سائے کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا، اسی طرح محبت کرنے والی ہستیوں کے دلوں میں قربتوں کا احساس تاحیات رہتا ہے۔

اقبال جہاں قدیر، میں جنھیں اقبال آپا کہتی ہوں، طبیعت میں نزاکت رکھتے ہوئے بھی اپنی ذمہ دارانہ صلاحیتوں سے انصاف کرتی رہتی ہیں۔ مجھے انکی عادتوں میں سب سے زیادہ جو پسند ہے وہ ان کا "اندازِ تخاطب" ہے جو اپنے پن کا بھرپور احساس دلاتا ہے، لہجہ کا والہانہ پن انکے دلی تاثرات کی ترجمانی کرتا ہے۔ کم لفظوں میں اچھی بات، مختصر جملوں میں مفید مشورے ان کی فطرت ہے۔ اتنا بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ ان کی علمی، تہذیبی، تاریخی دلچسپیاں ان کو اپنے جاگیردار و تعلیم یافتہ گھرانے سے ورثے میں ملی ہیں، اقبال آپا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو کام دماغ سے کرتے ہیں اور محبت دل سے ۔۔۔!

--

62 سے 92 تک

1962ء سے عملی زندگی کا آغاز خود بخود ہوا' میرے ارادے کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں تھا' لیکن حالات سے سمجھوتہ کرنے کا درس مجھے اپنی قناعت پسند طبیعت نے بچپن ہی سے دیا ہے۔

62 سے 92 کے درمیان پہلے تلاً یاز مسافر کی طرح میں "بے وزنی" کا شکار ہوتی رہی' اس کے باوجود میرے قدم جم نہ سکے' کچھ شعور کی کمی اور کچھ ناسازگار ماحول نے چین سے رہنے نہیں دیا' سانسوں کے لئے آکسیجن تو ملتی رہی لیکن "کششِ ثقل" مجھے "زیر و زبر" کرتی رہی۔ اس دوران کئی متوقع اور غیر متوقع حالات کا سامنا رہا۔ کبھی موجِ غم سے ٹکرائی تو کبھی آس کے ساحل پر ٹوٹے سفینوں کا شمار کرتی رہی' کبھی تیز اُجالوں نے آنکھیں چُندھیا ڈالیں تو کبھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر بھی کچھ نظر نہیں آیا' کبھی اضطراب آمیز خاموشیوں کا ساتھ رہا تو کبھی اپنی تنہائیوں سے ہم کلام رہی ......

زندگی کی راہ میں یوں تو بہت لوگ ساتھ چلتے ہیں لیکن وہ سب کے سب مسافر ہوتے ہیں اور اپنی اپنی منزلوں کا تصور لے کر چلا کرتے ہیں ۔ "منزل" کی طرح کوئی "اپنا" اتفاق سے ہی ملتا ہے۔

رشتوں کے دائرے جتنے محدود ہوتے ہیں آرزوؤں کا حصار اتنا ہی وسیع

ہوتا ہے، کوئی جی جان سے "اپنا" ہو، یہ خواہش ہمارے وجود کے ساتھ ہوتی ہے ہم جیتے تک فنا نہیں ہوتے یہ خواہش بھی نہیں مرتی، کبھی نہیں مرتی ..... اور جب کسی آرزو کی تکمیل ہوتی ہے تو جینے کی تمنا بھی ختم ہو جاتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کی تمنا اور بڑھ جاتی ہے، ایک آرزو کے بعد دوسری، پھر تیسری .... یونہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

62 سے 92 کے درمیان تیس سال کا عرصہ ہے، 20 سال کے خلائی سفر سے کسی طرح گذر تو گئی لیکن "تیسرا دہا" بڑا آزمائشی رہا، اس لئے کہ شعور بیدار ہو چکا تھا، احساسات شدید ہو چلے تھے، میں نے اپنے قدم آخر زمین پر جما ہی لئے، نتیجہ یہ ہوا کہ دامن تار تار، اور پاؤں زخمی ہو گئے!!! اس میں شک نہیں راہِ زندگی بڑی پُر خطر اور بہت ہی دشوار تھی لیکن مخالف ماحول میں "انتقاماً" جینے کا شوق جنوں کی حد کو چھونے لگا تھا، نفس نفس چنگاریاں، قدم قدم شعلے، تنہائی کے باوجود میں نے خود کو خاک ہونے سے بچا لیا اور تمام چنگاریوں کو سمیٹ کر اپنی "شمعِ حیات" روشن کر ہی لی، روشنی مدھم سہی مگر ہے، یہ احساس میری کامیابیوں کا ضامن ہے، کبھی نہ کبھی میری اس شمع کی مدھم روشنی میں جستجوئے شوق کے کئی کارواں منزل تک پہنچ ہی جائیں گے۔ یہ کب ہوگا معلوم نہیں، لیکن ایسا ہوگا یہ مجھے یقین ہے سہ

ہر رُت میں ایسے لوگ متاعِ چمن رہے
جو اپنے گھر میں رہ کے غریب الوطن رہے

"1992"

ہلکی سی کراہنے کی آواز سنتے ہی سر اُٹھا کر میں نے دیکھا، سامنے ایک خستہ حال شخصیت یعنی کہ فقیر کی طرح کوئی کھڑا تھا، جسم پر تار تار پیرہن اور جگہ جگہ گہرے زخم تھے، بال اُلجھے ہوئے، چہرے پر دُھول کی کئی تہیں، آنکھوں میں زندگی کی ذرا بھی رمق نہ تھی، میں نے پوچھا، کون ہو تم؟ اُس نے بھرائی ہوئی نحیف آواز میں کہا ..... 1992ء .... !

ارے، تم 1992 ہو؟ اور 1993 کی آمد کے پُرمسرت موقع پر تم نے اپنا یہ حال بنا رکھا ہے؟ کیا اسی طرح "مہمانِ خصوصی" کا استقبال کیا جاتا ہے ....؟ میرا اندازِ گفتگو جارحانہ تھا، اُس نے بُجھے بُجھے سے لہجہ میں کہا "کیا کروں میری یہ حالت اِس دور کے اُن تہذیب یافتہ لوگوں نے بنائی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ترقی کی سمت گامزن ہیں، مجھ سے بے انتہا بدسلوکی کی ہے، مجھے اُس شہ نشیں سے ذلت کے ساتھ دھکیل دیا جہاں مجھے اعزاز دے کر بٹھایا گیا تھا۔" 1992 کی آنکھوں سے قطار در قطار اشک بہتے ہوئے جھیل کی شکل اختیار کرنے لگے تھے، وہ سسک رہا تھا، میں نے اُسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی تو کہنے لگا۔ "دراصل آج میں تم سے آخری بار مل کر رخصت ہونے آیا ہوں کیونکہ تم ہی تو میری قدرداں ہو، تم نے مجھے اپنی

تحریروں سے نہ صرف سنوارنے کی کوشش کی، بلکہ بڑی عقیدت کے ساتھ میری یادوں کو محفوظ کر دیا ہے۔" میں نے اس کے رِستے ہوئے زخموں کو چھونا چاہا تو وہ تڑپ گیا" نہیں، نہیں، میرے زخم کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے، رہنے دو۔" 92، مایوسی کے بحرِ بیکراں میں ڈوب چکا تھا، میں اُسے ڈوبنے سے بچا نہیں پا رہی تھی، پھر بھی میں نے تسلی دینے کے لئے کہا" 92! 93 آ رہا ہے نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" تو 92 نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو" نادان! میرے زخم تو لقمان دوبارہ جنم لے کر بھی مندمل نہ کر سکے گا، خضر بھی اپنی حیات دے دے تب بھی میں نہ جی سکوں گا"......

میں نے اُس کی " خموش گفتگو محسوس کی، چاہا کہ 92 کی دردناکیوں کو اپنے اندر سمیٹ لوں، لیکن اس خیال کے ساتھ ہی دل میں نشتر سا چبھا اور میرے منہ سے آہ نکل گئی۔

92ء کی آنکھوں سے لہو بہنے لگا، بالآخر اُس نے میرے سامنے ایک ہچکی کے ساتھ دم توڑ دیا، 93 کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ان تکلیفوں سے بے پرواہ میری طرف مسکراتے ہوئے بڑھا چلا آرہا تھا، خدا جانے اس مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے، میں ابھی تک یہ بات سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ...... یہ مسکراہٹ جان دار ہے یا بے جان...... ؟؟؟

تہذیب کی سرحد پر

(حیدرآباد کے ۴۰۰ سال)

تنہائی کی گنبد سے نکل کر چار سو سال کی سرحد سے آگے آتے ہوئے میں نے پیچھے مڑکر دیکھا، ارے، یہ کیا ؟ یہ "شہرِ محبت" دھندلا سا کیوں لگ رہا ہے ... ؟ حالانکہ "شہرِ محبت" میں اُجالوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور اپنے مہکتے آنچل کا سایہ ہم پر ڈالتے ہوئے گذر جاتی ہے، دل میں ہزاروں پھول کھلا دیتی ہے۔ نہ جانے یہ دُھندلاہٹ کیسی ہے ؟ کیا میری آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی ہے ؟ یا پھر اس شہر کا اُجالا ہی مدھم ہوگیا ہے ؟ کہیں سورج تو پُرانا نہیں ہوگیا ؟ چار سو سال سے یہ شہر جگمگاتے ہوئے کہیں تھک تو نہیں گیا ... ؟ سُنیے تو ... ! میں نے راہ چلتے ہوئے ایک تیز رو مسافر کو روکا، وہ بڑی ہی معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا مجبوراً رُک گیا، میں نے پوچھا کیا یہی شہر حیدرآباد ہے جو محبت کا گہوارہ کہلایا جاتا ہے ؟ جس میں اتنے اُجالے ہوا کرتے تھے کہ لوگ دُور دُور سے آکر یہاں روشنی میں نہایا کرتے تھے اور میٹھے میٹھے لہجے کا رس پی کر سرشار ہو جایا کرتے تھے ... ؟ مسافر ہنس پڑا اور جواب دیئے بغیر چلتا بنا۔ میں حیران رہ گئی ... یہ لوگ اِس شہر کے بالکل نہیں لگتے، پہلے تو سب ایک دوسرے کے پرسانِ حال ہوا کرتے تھے، آج سوال کرو بھی تو جواب نہیں ملتا، مٹّی کی خوشبو بھی تیز نہیں ہے، میں نے کمانوں، محرابوں اور مناروں سے آراستہ شہر کی بدلی ہوئی ہیئت دیکھی ... اُف ... یہاں تو ڈبّوں جیسی عمارتیں کھڑی تھیں سبھی دروازے کھڑکیاں بند تھیں، ہوا کا مہکتا آنچل لہراتے ہوئے نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا، محبت اور پیار کی خوشبو، ماحول کی کثافت میں ضم ہوگئی تھی، ایسے میں اگر کوئی سُریلا نغمہ چھیڑ دیتا تو

ساری نغمگی اِن بے ہنگم آوازوں کے طوفان میں ڈوب جاتی جو فضا کو جھنجوڑ رہی تھیں، احساس کو مرتعش کر رہی تھیں۔

میں ابھی تک چار سو سال کی سرحد پہ ہی ٹھہری ہوئی تھی، میں ایک کتبے کی طرح مری ہوئی تہذیب کے تربت کے سرہانے یوں ٹھہری ہوئی تھی جیسے میرے سوالیہ چہرے پر "کندہ" نہ مٹنے والی تحریر کا جواب ملے نہ ملے لیکن میں پتھر کی لکیروں کو اپنے چہرے پر سجائے اُس دن کا انتظار کرتی ہی رہ گئی جہاں تاریخ کو دہرانے کی کوشش میں جشن منایا جائے گا۔ دھوئیں کے مرغولے میرے سامنے سے رقص کرتے ہوئے گذرنے لگے۔۔۔ مجھے ہجوم بے پناہ کی ہر نظر "کبیدہ" سی لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں چار سو سال کی سرحد سے دور ہو جاؤں یا کوئی مجھے اِس "شہرِ محبت" کی اِن بوسیدہ دیواروں میں چنوا دے جو نفرت کی آندھیوں کو روک سکتی ہیں جو اُن طوفانوں کا رُخ موڑ سکتی ہیں جو نظر نہیں آتے مگر محسوس ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

کاش! میں مری ہوئی تہذیب کی مسیحا بن جاؤں اور اس میں روح پھونک دوں اُسے احساس دلاؤں کہ وہ مری نہیں، زندہ ہے اور پھر وہ تہذیب جو "شہرِ محبت" کا دل ہے، جذبۂ احسان مندی سے متاثر ہو کر مجھے اپنے گلے لگا کر کہے "مبارک ہو! اس چار سو سالہ جشنِ حیدرآباد کا سہرہ تمہارے ہی سر رہا۔۔۔!"

اب جبکہ یہاں سے اُجالے فرار ہو چکے ہیں، میں ان کی تلاش میں خود کو کھونا نہیں چاہتی۔ میں اجنبیت کے حصار میں بند ہو کر بھی بے نیاز سی اسی سرحد پہ کھڑی ہوں جہاں کوئی محافظ نہیں، نہ میرا نہ میرے شہر کا۔۔۔۔!!!

O

مجسّمہ

آنکھیں موندے، لو لگائے بیٹھے ہوئے اس مُجسّمے میں ذراسی حرکت ہوئی اور پھر دھیرے دھیرے اس مجسّمے نے آنکھیں کھول دیں۔ ......

چہچہاتے پرندے گھنے درختوں کی ڈالیوں پر جمع ہونے لگے تھے، نہ جانے یہ کونسی گھڑی تھی، ان ساعتوں کا نام کیا تھا؟ بے چارے اس مجسمے کو کیا پتہ تھا کہ یہ شام کی وہ ساعتیں ہیں جن ساعتوں میں بہتا پانی ساکت و جامد ہو جاتا ہے، آفتاب سُرمئی نقاب میں منہ چھپائے اُفق کے اُس بازار میں چلا جاتا ہے جہاں رنگ و نور کے میلے لگے ہوئے ہیں، جہاں کرنیں شفق کا شوخ لباس پہنے تھم تھم کر رقص کرتی ہیں جہاں دانشوروں کی نگاہیں رُکی رہتی ہیں، جہاں اہلِ خرد صبح و شام کے اس امتزاج سے طمانیت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مُجسّمہ پتھر کا ہوتا ہے اُسے احساس ہوتا ہی نہیں، وہ تو اتفاق کی بات تھی کہ اُس میں جان آگئی تھی اور اُس نے آنکھیں کھول دینے کا جرأت مندانہ اقدام بھی کر ڈالا تھا اور اس منظر کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجسّمہ تھا صرف مجسّمہ، جسے کسی نے تراش کر اس جنگل میں ایک جھاڑ کے نیچے اپنے فن کے ثبوت کے طور پر بٹھا دیا تھا کہ وہ مانگنے والوں کی خواہشیں گنتا رہے، اُن محرومیوں کے آنسوؤں کا شور سُنتا رہے جو نامرادوں کے دل میں طوفان بنے بھرتے رہتے ہیں۔

بھلا وہ پتھر کا مجسمہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس نے اپنے سراپا پر ایک نظر ڈالی، کئی پھول مالائیں گلے میں پڑی سوکھ گئی تھیں، خوشبو اُڑنے والے سانپوں کی طرح سرسراتی پھر رہی تھی ———

آس پاس سوکھے پتے اور پکے ہوئے نیم کے پھل لذتِ کام و دہن کا اشارا کر رہے تھے، زخمِ حیات کے گھنے پودوں کے ننھے منّے پھول یوں جھوم رہے تھے جیسے کہ اُنھیں وجد آ رہا ہو ———

مجسّمے کی زبان سننے کی کوشش میں کئی پرندے مجسّمے کے شانوں پر بیٹھے سُریلی آواز میں سوالات کئے جا رہے تھے۔

مجسّمہ اِن ساعتوں سے بے زار ہو گیا اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا جسم اُس کے قابو میں نہیں ہے، کوئی غیر مرئی طاقت اُسے یہاں سے اُٹھنے پر مجبور کر رہی ہے اچانک مجسّمے نے ایک طویل انگڑائی لی اور کھڑا ہو گیا۔ تنا اور درخت لرز گئے۔ زخمِ حیات کے پودے اُس کے پاؤں تلے مسل گئے، شانوں پر بیٹھے پُر اُمیّد پرندے آشیانوں کی پرواہ کئے بغیر اُڑ گئے۔ سوکھے پتے پاؤں تلے دب کر کھڑکھڑانے لگے میٹھی نبولیوں نے اُس مجسمے کو اُکسانا شروع کیا کہ وہ انھیں ذرا چکھ لے، اور ایسا ہی ہوا، مجسّمے نے جھک کر کئی نبولیاں میٹھی میٹھی نبولیاں منہ میں رکھ لیں، مٹھاس خواہش بن کر مجسّمے میں سما گئی۔ مجسّمہ آگے بڑھنے لگا۔ نیلگری کے درختوں کا سلسلہ اِس مجسمہ پر سایہ فگن ہو گیا۔ خوشبو نے اپنا دامن پھیلایا۔ شب نے اپنے ماتھے سے گھونگھٹ ہٹا دیا، چاند کا جھومر جگمگانے لگا، مجسمہ دیوانہ وار آگے بڑھنے لگا، اُس نے اپنے گلے میں پڑی سوکھی پھول مالائیں نکال پھینکیں۔

ہوائیں دامن سمیٹ کر مجسمے کی ہمسفر ہوگئیں، مجسمے کو احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے، کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہے مگر کون ؟ . . . . . . کون ہے اُس کے ساتھ ؟ خواہش ؟ . . . . مانگنے والوں کی . . . . . شور ؟ محروم دلوں کا . . . . لو ؟ اپنے خالق کی . . . . . یقین ؟ اپنے عاجز ہونے کا . . . . . ؟ ؟ ؟

رفتہ رفتہ مجسمہ ساکت ہونے لگا، بیٹھے ہوئے مجسمے نے جب چلنا شروع کیا تھا تو منظر کچھ اور تھا مگر اُس کے اُٹھتے ہی منظر کچھ اور ہوگیا، اور اس کی کیفیت کے ساتھ منظر پھر بدل گیا، مجسمہ پھر ساکت کھڑا رہ گیا، اَب وہ صرف پلکیں ہی جھپکا سکتا تھا، آسمان پر سُرخ اُجالا نمودار ہورہا تھا چاند کا جھومر ماند پڑنے لگا مگر ایک ستارہ اَب بھی مسکرا رہا تھا . . . . جھلمل . . . . جھلمل . . . . جھل . . . . مل . . . . جھل . . . . . مل ، اس کی نیلگوں روشنی اب بھی چھلک رہی تھی ، جامِ فلک میں اب بھی اُجالوں کی بوند باقی تھی۔ مُجسّمہ پلکیں زور زور سے جھپکانے لگا، کرنوں کا آبشار بہنے لگا ، سورج نے اونگھتی زمین کا ماتھا چُوم لیا، نیلگری کے درختوں سے پھول جھڑتے لگے، پرندے نغمے سنانے لگے، مجسمے کے منہ میں مٹھاس بن کر مزہ دینے والی نبولیاں نیم کے کڑوے پتوں میں چھپ گئیں ــــ سورج دہکنے لگا۔ تپش بڑھتی گئی، مجسمہ انسان نہیں تھا جو کہیں پناہ ڈھونڈلیتا، اُس نے گھبرا کر آنکھیں موندلیں اور پہلے کی طرح لَو لگائے ساکت ہوگیا، مانگنے والوں کی خواہش اور بڑھ گئی، نامرادیوں کا شور اور بڑھ گیا، مجسّمے کے گلے میں اَب سوکھے پھولوں کی مالائیں نہیں، تازہ پھولوں کے ہار تھے . . . . !!!

ــ ــ

"اَب کے برس"

(رسمِ اجرا کے موقع پر)

(۲۳ مئی ۱۹۹۷ء)

جب تھپیڑے کھاتے ہوئے کبھی کوئی مچھلی کنارے پر آپڑتی ہے تو اس کی اضطرابی کیفیت اور تڑپ دیکھ کر کوئی "راہ گیر" اُسے واپس پانی میں ڈال دیتا ہے، دوبارہ پانی میں تیرتی ہوئی مچھلی کو جو خوشی اور راحت محسوس ہوتی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔

زندگی کے اس پُرمسرت موقع پر میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں ؎

کسے خبر تھی ہماری بھی یہ نظر ہوگی
ہمیں بھی چاند ستاروں کی کچھ خبر ہوگی

برسوں لمحہ لمحہ پگھلنے کے بعد "اب کے برس" (یہ شعری مجموعہ) آپ کے سامنے ہے۔ حالات کی دھوپ میں جلی ہوں، اُمیدوں کی چاندنی میں کھلی ہوں، بہار و خزاں کے موسم مجھ پر سے گذرتے رہے۔ ہر قدم اک نئی منزل ملی، اک نیا امتحاں رہا۔ میری آرزو کی منزل مجھے بہت دور محسوس ہوئی۔ طائرِ دل، شوق کے آسمانوں کی طرف پرواز کرنے کو تڑپتا رہا۔ آخر جب مجھے محسوس ہوا کہ میری شام قریب ہے۔ اس طرح میں تھکے تھکے قدموں سے منزل تک نہیں پہنچ سکوں گی، تو میں نے ہمت کی اور ایک جست لگائی۔ محفلِ خواتین میں، محفل کی خواتین نے مجھے گرنے نہیں دیا۔ مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا اور میں بے سرِ پیر کا تاج سمجھی گئی۔ محفلِ خواتین کی محبت نے میرے قدم تلے

پھولوں کے ڈھیر لگا ڈالے میں فرشِ گل پر چلنے لگی۔ خوشبو کا احساس میرے وجود کے اندر اتنا شدید تھا کہ میں اس خوشبو کے سفر میں قدموں تلے آنے والے سبھی کانٹوں کو روندتی چلی گئی۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ، محترمہ فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ، محترمہ نایاب سلطانہ صاحبہ اور محترمہ آمنہ حیدر خاں صاحبہ اور کئی معزز خواتین کے حوصلہ افزا اعتماد نے مجھے اُسی مسند پر بٹھا دیا۔ جہاں چاند ستارے جگمگاتے ہیں، جن کی روشنی دنیائے ادب کو خیرہ کئے ہوئے ہے، تیز روشنی کے آگے بے نور چیزیں بھی چمک اُٹھتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُردو سے دلچسپی مجھے بچپن سے رہی ہے۔ شعر گوئی کا شوق بھی کم عمری سے میرے ساتھ رہا، لیکن حالات کا تعاون مجھے نہ مل سکا، چنگاریاں دبی رہیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں نے ان چنگاریوں کو ہوا دی اور چراغ جل اُٹھے، مجھ پر روشنی کا عکس پڑنے لگا، میں بھی نظر آنے لگی۔ جب میری کتاب کے بارے میں اُن ہستیوں نے اپنی رائے لکھی، جن کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی میرے لئے اعزاز ہے تو میں حیران رہ گئی۔ اپنے آپ سے کہا۔ " فاطمہ تاج! دیکھو تو تمہارے سوئے نصیب جاگ اُٹھے ہیں، لوگ تمہیں جاننا چاہتے ہیں، اٹھو اور اپنا تعارف زمانے سے کرواؤ۔" پھر محفلِ خواتین کی معزز و مہرباں شخصیتوں نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں اُٹھ سکے پر میں، اپنا تعارف دنیا کو دے ہی بیٹھی۔ میں نے اپنی پہچان بنائی، لیکن اِسی احساس کے ساتھ کہ اگر میری معاون ہستیاں مجھے سہارا نہ دیتیں تو بھلا میں کیسے کامیاب ہوتی؟ ہے نا؟ اپنی ذات سے وابستہ زندگی کی اس پہلی خوشی میں شامل سبھی معزز ہستیوں کی میں احسان مند ہوں کہ انھوں نے میری خوشی میں شریک ہو کر اس خوشی کے

احساس کو دوبالا کر دیا۔ کتاب کی اشاعت سے متعلقہ تمام ہستیوں کے پُرخلوص تعاون سے میں بے حد متاثر ہوں، آج کی محفل کو رونق بخشنے والی معزز خواتین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صرف غم ہی نہیں بانٹے جاتے بلکہ خوشی بھی تقسیم ہو سکتی ہے، کیونکہ خوشی بے حد وزن دار ہوتی ہے۔ تنہا خوشی کا بوجھ اُٹھانا کم سے کم میرے بس کی بات تو نہیں۔



گردشِ ماہ و سال

ماہ و سال کی گردشوں کا مرکز بھی کوئی ہوتا ہے، جیسے خیالوں کا کوئی مرکز ہوتا ہے، خواہشوں کا کوئی مرکز ہوتا ہے۔ مسلسل اشک بہتے ہوں تو اس غم کا بھی کوئی مرکز ہوتا ہے۔ انسان اپنے طور پر بہت سے کام انجام دیتا رہتا ہے لیکن اپنے اس خیالی مرکز کو ذرا دیر بھی نہیں بھول پاتا، وہ کبھی اپنے خیالی مرکز کو نظر انداز کر کے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ ایسا اگر کبھی ہو بھی جائے تو یہ غیر اطمینان بخش ماحول مسلسل مصروفیت کا سبب ہو جاتا ہے جس سے احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے، رہی گردشِ رنگِ چمن کی بات، تو اس کا انحصار ہمارے ہی تصور پہ ہوتا ہے موسم کی خبر عندلیب آنسو بہا بہا کر دیتا ہے، اب یہ سمجھنا ضروری نہیں کہ یہ آنسو خوشی کے ہیں جو موسمِ بہار کے موقع پر نکل پڑے ہیں یا خزاں کے جھلسا دینے والے غمناک

موقع پر بہنے لگے ہیں۔ عندلیب کے آنسو انسان کے آنسوؤں کی طرح لعل و گہر سے مطابقت نہیں رکھتے بلکہ خزاں و بہار کے شب و روز کی تفسیر ہوتے ہیں، اور کیوں نہ ہوں؟ عندلیب کی عمر تو چمن میں ہی گذرتی ہے، جس طرح باغباں کی زندگی آرائشِ چمن میں بسر ہوتی رہتی ہے۔ وہی ننھے پتوں کے درمیان کھلتے ہوئے خوش رنگ تازہ پھولوں کی حفاظت، وہی کانٹوں کا حصار، کاندھوں پر آشیاں کا بوجھ اٹھائے ہوئے وہی شاخِ شجر جس کے خیال میں باغباں سیرِ چمن کے لئے آنے والوں پر صیاد کا شبہ کرنے لگتا ہے۔ آرائشِ چمن، صاحبِ چمن کے لئے ہوتی ہے اور آرائشِ چمن صرف بہار میں ہی نہیں خزاں میں بھی ہوتی ہے۔ ہوا کے گرم جھونکے درختوں کے سر سے سبز چادر لے اڑتے ہیں، پھولوں پر زردی چھا جاتی ہے کانٹے خودسری پر اتر آتے ہیں، وہ کانٹے جو دیکھنے میں بڑے حسین، بڑے نازک لیکن باغبانی کے دستور کے عین مطابق محافظ کا انداز لئے ہوئے رہتے ہیں۔ زمین جیسے گردش کرنے لگتی ہے تو اندھیرے میں رہنے والے وہ گوشے بھی اجالوں کی زد میں آ کر اجاگر ہو جاتے ہیں، جہاں کسی بھی موسم کا کبھی گذر ہی نہیں ہوتا، نہ چمن نہ صحرا بس، سادہ سی پتھریلی زمین، جس پر چلنے والے کے پاؤں میں چھالے آجاتے ہیں، پھر زخم بھی پڑجاتے ہیں، ان سے لہو بھی بہتا ہے اور یہ لہو کے نشان پتھریلی زمین کو لالہ زار کر جاتے ہیں۔ اہلِ نظر اسے تزئینِ گلستاں کہتے ہیں، یہ پتھروں پر یہ نشان پھول جیسے لگتے ہیں لیکن یہاں موسم کی کوئی قید نہیں ہوتی، خزاں ہو کہ نہ ہو، بہار آئے نہ آئے یہ پتھر اپنی آرائشوں کے ساتھ جمے رہتے ہیں۔ انسان اپنی حیات کے چمن کو طرح طرح سے سجاتا ہے۔ کہیں آرزوؤں کی کلیاں، کہیں خواہشوں

کے غنچے، چمنِ حیات کو اندیشوں کے حصار میں محفوظ کرنے کے بعد بھی اطمینان نہیں ہوتا، بالکل نہیں ہوتا۔ آخر گردشِ ماہ و سال، سوئے ہوئے موسم کو جگا دیتی ہے کسی نہ کسی طرح احساس کے آنگن میں صبا کے جھونکے چلے ہی آتے ہیں، کلیاں پھول بنتی ہیں، غنچوں پہ نکھار آجاتا ہے، شبنم کے ٹھکانے بھی ہو جاتے ہیں، کبھی کاسۂ گل میں تو کبھی چشمِ عندلیب میں، گردشِ ماہ و سال اپنی نیند سے بیدار نہیں ہوتی، یہ صرف کروٹیں بدلتی رہتی ہے، یہ جب کروٹ بدلتی ہے تو سب کلیاں، غنچے خواب ہو جاتے ہیں۔ کاسۂ گل نامراد آنکھوں کی طرح خشک ہو جاتا ہے، چشمِ عندلیب مگر "نم" ہی رہتی ہے، اس کی آہ و فغاں صحنِ گلستاں میں گونجتی رہتی ہے، شبنم کا بھیس بدلی ہوئی پریوں کو گرم ہواؤں کے "دیو" اٹھا لے جاتے ہیں، اڑتی ہوئی دھول قدموں کے نشان بھی باقی نہیں رہنے دیتی، یہ اڑتی ہوئی دھول، ماہ و سال کی رفیق نہیں ہوتی، یہ دھول فلک کے اس آئینے پر بھی نہیں جم سکتی جہاں آفتاب و مہتاب کے چہرے جگمگاتے رہتے ہیں، جو کسی نظر کا خواب ہوتے ہیں جو چمنِ حیات کے نظاروں کا حاصل ہوتے ہیں۔ انسان اس شب و روز میں الجھا ہوا مختلف موسموں سے گذرتا ہوا گردشوں کے ساتھ چلتا رہتا ہے، بہار ہو تو اندیشۂ خزاں میں اور خزاں ہو تو امیدِ بہار میں عمر صرف ہوتی رہتی ہے، لیکن وہ مرکزِ خیال صحیح درجہ کر کبھی مکمل ہو کر سامنے نہیں آتا جس کے خواب انسان اپنی آنکھوں میں چھپائے رکھتا ہے عندلیب کے ان آنسوؤں کی طرح جو موسم کی قید سے آزاد ہوتے ہیں، بالکل آزاد... مرکزِ غم سامنے ہو تو کنارہ کشی کی جا سکتی ہے لیکن خیالوں میں بسنے والے ان مسیحاؤں کا شکوہ نہیں کیا جاتا، جو پہلے زخم دیتے ہیں اور بعد میں مسیحائی کرتے ہیں۔

(آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا)

(جون ۱۹۹۲ء)

کوئی مسرتوں کا حاصل تو ہوتا ہے مگر اظہارِ مسرت میں انسان کامیاب نہیں ہوسکتا، یہ تو صرف محسوس کرنے کے لئے ہے اور جب مسرتوں کا احساس ہوتا ہے تو عندلیب کی آہ و فغاں بھی ترانۂ بہار لگتی ہے، بہتے ہوئے آنسو بھی خوشیوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ ع

گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب



مسلم خواتین کے مسائل پر سمینار

(رپورتاژ)

۱۷ر جون کی صبح بڑے انتظار کے بعد آئی۔ مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی کی ڈائمنڈ جوبلی تقریب کے موقع پر "مسلم خواتین اور ان کے مسائل" کے زیرِ عنوان ایک سمینار کے انعقاد کی گرما گرم خبریں میں مسلسل اخبار میں پڑھ رہی تھی، تہیہ کر چکی تھی کہ میں ضرور اس سمینار میں شریک رہوں گی۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ سے اکثر فون پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ سلطانہ آپا نے کہا کہ تم اس سمینار کی تفصیل لکھنا۔ اُستادوں کا حکم مانتے ہوئے یہاں تک تو پہنچ گئی اب انکار کی ہمت بھلا کیسے ہوتی؟ میں نے حامی بھر لی پھر اس کے بعد محترمہ فاطمہ عالم علی خاں سے فون پر بات چیت کا سلسلہ رہا۔ یہاں بھی

مجھ سے یہی اُمید کی گئی اور پھر میں ایک ایک، پل گن کر گذار نے لگی۔ آخر ۱۳ جون ۱۹۹۲ء کی یادگار صبح ہو ہی گئی۔ ہم "مدینہ ایجوکیشن سنٹر" پہونچے۔ اندر کئی رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ محترمہ شمیم علیم صاحبہ نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر استقبال کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے شمیم علیم کہتے ہیں"۔ مجھے خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے قدم آگے بڑھایا سلطانہ آپا (سلطانہ شرف الدین صاحبہ) سامنے ہی ٹھہری ہوئی تھیں۔ فوراً میرا ہاتھ تھاما اور اپنے پاس بٹھالیا۔ میں نے گردن پھیر کر دیکھا، اُف! وہی جلوے نظر کے سامنے تھے جو ہر ماہ محفلِ خواتین میں ہوتے ہیں۔ ہماری رو میں بیٹھی ہوئی تھیں مسز برہان الدین، محترمہ خورشید حمید پاشاہ، محترمہ قادری بیگم، سلطانہ آپا، میں اور میری بیٹی۔ آگے والی صف میں تھیں آمنہ حیدر خاں، فیض النساء، مسز وہاب الدین، مسز انیس حسن الدین اور میری ایک عزیز دوست زینت اماں۔ اس سے آگے والی صف میں تھیں مسز وحیدہ ہاشم علی اختر، جیلانی بانو اور فاطمہ عالم علی خاں، نزہت خاتون اور سوڈان سے آئی ہوئی مہمان خاتون ثریا حمدون۔ ان تمام مہمانانِ خصوصی کو میں نے "حصارِ نظر" میں لینے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو آر بانو صاحبہ نے مجھے محصور کر رکھا تھا اور بھی محفلِ خواتین سے متعلق خواتین تھیں۔ کچھ اجنبی خواتین بھی تھیں۔ شمیم علیم صاحبہ، کنوینر تھیں اور بڑے سلیقے سے اس موقع پر مہمانوں کے استقبال میں لگی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ممتاز ڈاکٹر سلطانہ خاں جلوہ گر ہوئیں اور آگے کی صف میں جا بیٹھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہال کے باہر تیز دھوپ سہی لیکن ہال کے اندر چاندنی کھل اُٹھی ہے۔ میں نے اپنی قاصد نظروں کو آگے بھیجا جو میری عزیز ست عالیہ خاں کا سلام لے کر لوٹیں، ماشاء اللہ ہال خواتین

و طالبات سے بھر چکا تھا اور تنگئ دامن کی شکایت کر رہا تھا یا یوں سمجھئے کہ "ساغر ہال میں صہبائے ہجوم چھلکے جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد لیڈی گورنر سمن کرشنا کانت صاحبہ حفاظتی دستے کے ساتھ ہال میں داخل ہوئیں۔ سب خواتین اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ جب لیڈی گورنر صاحبہ اسٹیج پر اپنی نشست پر بیٹھ گئیں تو شمیم صاحبہ نے لیڈی گورنر اور تمام خواتین و طالبات کو خوش آمدید کہا، پھر ڈاکٹر سلطانہ خاں کی صدارت میں جلسہ کا آغاز ہوا۔ نجمہ کی قرأت کلام پاک سے پروگرام کی ابتدا ہوئی، اس کے بعد انیس رحمٰن نے استقبالیہ تقریر کی، پھر لیڈی گورنر سمن کرشنا کانت نے اپنی تقریر شروع کی، جس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔

"ہمیں آج ترقی کے لئے خود ہی راستے تلاش کرنے ہوں گے۔ ہر بات سے پہلے ہم اپنے گھر میں دیکھیں گے، گھر کے بارے میں سوچیں تو پھر دیش کی بات کر سکتے ہیں، تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں۔ ہمارے دیش کا جو امیج بنا تو اس میں بھی سبھی لوگ مل بیٹھتے تھے۔ تبادلۂ خیالات کرتے تھے اور پھر عملی قدم اٹھاتے تھے۔ مردوں کا تعاون ملے گا تو عورتیں آگے بڑھ سکیں گی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ لڑکیوں اور بہوؤں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ مائیں ذمہ دار ہیں کہ ہماری بچیاں تعلیم حاصل کریں یا ان پڑھ رہیں۔ جتنی بہادر جتنی قابل ماں بنے گی اتنی ہی بہادر اتنی ہی قابل بیٹی ہو گی۔ ہندوؤں میں بھی پہلے پردہ تھا، جیسے جیسے عورتوں کو آزادی ملنے لگی، ترقی کی راہیں کھلنے لگیں، پھر یہ رواج ختم ہو گیا۔ منہ پر پردہ ڈالے رہنے سے ترقی کا راستہ کیسے نظر آسکتا ہے۔ میں خاص طور پر اپنی عمر کی مسلم بہنوں سے چاہوں گی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو سماج میں اوپر اٹھانے کی کوشش کریں۔ عورتوں کے

بے جا بندھن ان کی ترقی میں حائل ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے ہر ایک کو بلا امتیاز پیدا کیا ہے، مذہبی لحاظ سے الگ الگ دنوں میں جنم نہیں رکھا، ہندو، پارسی، مسلم، سکھ عیسائی الگ مذہب کے باوجود ایک ہی مخلوق میں پیدا ہوئے ہیں۔ لڑکیاں شادی کے بعد میکے سے جدا ہو جاتی ہیں۔ بچے ہوتے ہی مرد برتری جتانے لگتے ہیں، مرضی کے خلاف ہو کر مار پیٹ اور طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا ہمیشہ دوست رہنا چاہیئے۔ آگے بڑھنا پھر آسان ہوگا اور فائدہ مند بھی۔ اپنے گھر اور سماجی مسائل عورت کو خود اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، کسی رہنما کا انتظار کئے بغیر اپنے باپ، بھائی، شوہر کو خود اپنے مزاج پر بلانا چاہیئے، یہ کام اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں کی خودکشی کا سبب یہی ہے کہ ان کے ساتھ کسی کا تعاون نہیں ہو سکتا۔ صرف پڑھا کر چھوڑ دینا کافی نہیں۔ لڑکی کو بہادر بنائیے، لڑکی کو سلیقہ سکھائیے کہ وہ خود اپنے مسائل حل کر سکے، صرف ہندو یا مسلمان کے بارے میں نہ سوچئے، ہندوستان کے بارے میں سوچئے۔ ہندوستانی لڑکیوں کے بارے میں سوچئے۔ جب تک لڑکیوں کی تعلیم نہ ہو ان میں خود اعتمادی نہیں آسکتی۔ پڑھائی کا مطلب ہے کامیابی۔ پڑھی لکھی لڑکیاں سماجی خرابیوں کے خلاف آواز اٹھا سکتی ہیں۔ لڑکیاں اگر پڑھی ہوں تو کیسے ان حالات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ ان کے سرپرستوں کو بھی انہیں آزادی دینا چاہیئے کہ وہ تعلیم حاصل کریں۔ ملازمت کر سکیں۔ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں اور مرد کا ساتھ دے سکیں۔"

پھر شمیم علیم صاحبہ نے اپنی ایک مختصر تقریر میں کہا کہ "بے جا رسومات کی بات تو ہم کرتے ہیں لیکن ہم ہی اس سماج کے محافظ بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم یہ چاہیں کہ

ہمارے پچاس فیصد مسائل مرد حل کریں تو یہ ہماری غلطی ہے۔ عورت کیا نہیں کر سکتی لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم اپنے بارے میں سوچ نہیں سکتے۔ آج کا سیمینار اس لئے ہے کہ ہم خواتین میں احساس پیدا کریں۔ ہم سوئی ہوئی اندر کی عورت کو جھنجھوڑ دیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ پس افتادگی اور پستی کی وجہ ہماری مذہبی پابندیاں ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں عورت کا مقام بہت اعلیٰ ہے۔ اسے کافی حقوق حاصل ہیں لیکن یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم نے اسلام اور اسلامی قانون کو صحیح طور پر نہیں سمجھا، اس وجہ سے ہم کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ہم اپنے حقوق قرآن کی روشنی میں اُٹھائیں گے، غیر اسلامی آواز ہم نہیں اُٹھائیں گے۔"

پھر اس کے بعد سلطانہ خان نے شکر گزاری کے ساتھ اپنی تقریر شروع کی جو قابل توجہ ہی نہیں قابلِ عمل بھی ہے۔ "ہر عورت کے لئے آزادی، سماجی تعلیم اور رتبہ انتہائی ضروری ہے لیکن آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ لباس مختصر ہو جائیں، ترقی کا مطلب یہ نہیں کہ حق تلفیاں ہوتی رہیں، سب سے پہلے عورتوں کو جو رتبہ دیا گیا وہ سرکار دو عالمؐ کی وجہ سے دیا گیا۔ یہ مسائل صرف اس لئے ہیں کہ ہم غیر اسلامی قوانین کو اپنائے ہوئے ہیں۔ پستی کا سبب اسلامی قوانین نہیں بلکہ غیر اسلامی سماج کو اپنانا ہے۔ پردہ کبھی عورت کی ترقی میں رکاوٹ نہیں رہا اور پھر پردہ کا مطلب یہی نہیں کہ سر منہ ڈھانک لیں بلکہ یہ ہے کہ اپنے سنگھار، لباس اور بات چیت میں شائستگی اور وقار ہو اور جہاں تک عورت و مرد کے حقوق کا سوال ہے تو اسلام مساوات کا درس دیتا ہے نہ کہ تشدد کا۔ عورت کو پردہ کا حکم دیا گیا تو مرد کو بھی نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا مرد و عورت دونوں پر روزہ، حج و زکوٰۃ یکساں فرض ہیں۔ عورت تجارت کر سکتی ہے

جیسے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کرتی تھیں۔ عورتیں مردوں کے ساتھ میدان جنگ میں رہا کرتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں۔ عورتیں اس زمانے میں پڑھتی بھی تھیں اور پڑھاتی بھی تھیں۔ حضرت عائشہؓ سے خود سرکار دو عالمؐ بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ سرکار دو عالم صلعم کے پردہ فرمانے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحابہ کرامؓ بھی مسائل پوچھتے تھے۔ حدیث و فقہ کا درس بھی عائشہؓ دیا کرتی تھیں۔ سرکار دو عالم صلعم نے فرمایا کسی نے اگر لڑکی سے برا سلوک کیا تو یہ سلوک گویا کہ میرے ساتھ ہوا۔ کہا گیا کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ نہیں کہا کہ صرف مرد جائیں عورتیں نہ جائیں۔ اسلام میں طلاق حلال ہونے کے باوجود اللہ کو سخت ناپسند ہے لیکن یہ حق بھی ضرورتاً عورت و مرد کو برابر دیا گیا۔ نکاح کے لئے عورت کو بھی اختیار دیا گیا۔ اس کی رضامندی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے پیچھے نہیں مرد کے ساتھ رکھا ہے۔ اب یہی دیکھئے اگر دو پہیئے اچھے ہوں تو گاڑی چلتی ہے، اگر ایک بھی خراب ہو تو گاڑی چل نہیں سکتی۔ عورتوں پر بیجا اور غیر اسلامی پابندیوں کا مقابلہ خود عورت کو اسلام کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ عورت، مرد کی غلام نہیں ساتھی ہے۔"

نسیم عباس کی تقریر کا یہ حاصل تھا کہ اسلام کی روشنی میں ترقی حاصل کرتے ہوئے سماج کو سدھارنے پر زور دیا جائے۔ اس کے بعد خورشید حمید پاشاہ صاحبہ نے کہا "ماں کی گود پہلی تربیت گاہ ہے۔ ضروری ہے کہ ماں اپنی اولاد کی خاص طور پر بیٹیوں کی تعلیم پر دھیان دے، علم کے زیور سے آراستہ کرے۔ لڑکیاں جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں گی سماج میں جہالت کا دور ختم نہیں ہوگا۔"

پھر اس کے بعد دوسرے ہال میں چائے کا دور شروع ہوا۔ چائے پیتے پیتے
اچانک میری نظر زینب آپا پر پڑی جو میری ہی طرف آرہی تھیں۔ کچھ دیر بات ہوتی رہی
بلقیس آپا بھی وہیں مل گئیں۔ قریب ہی محمودہ صاحبہ بھی موجود تھیں۔ نایاب سلطانہ صاحبہ
بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ مجھے گرمی کے موسم نے اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ چائے کی طرف
ہاتھ مشکل سے بڑھ پایا۔ سلطانہ آپا مسلسل مجھے فروٹس اور بسکٹ سے سرفراز کئے جارہی
تھیں۔ انتظام بہت اچھا تھا۔ میں نے اس سیمنار کے اہتمام میں جو خاص بات نوٹ کی
وہ تھی " سلیقہ " بے ترتیبی ذرا نہیں تھی۔ پھر ہم واپس اپنی نشستوں پر آگئے۔

دوسرا اجلاس جیلانی بانو صاحبہ کی صدارت میں تھا۔ عالیہ خاں نے اپنی
معلوماتی تقریر سے بہترین مقرر ہونے کا ثبوت پیش کیا، جس کے چند لفظ تحریر میں
لانا چاہوں گی وہ یہ کہ " عام خیال ہے کہ شادی سے پہلے کام کاج کی عادت ہونی
چاہیئے۔ پڑھی لکھی لڑکیاں مردوں کی زیادتی برداشت نہیں کرسکتیں۔ آج کل لڑکے
زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اس لئے وہ زیادہ پڑھی لکھی لڑکی نہیں چاہتے۔ " اور پھر
ثریا حمدون اور فریدہ یوسف الدین اور مہ پارہ حسین صاحبہ نے بھی اپنے اپنے خیالات
کا اظہار کیا۔ مہ پارہ صاحبہ نے جہیز اور جوڑے کی رقم پر لعنت بھیجی اور روایتی
رشتوں کے لاحاصل رویہ پر بھی افسوس کا اظہار کیا اور کچھ " حل مشکلات " کے
نسخے بتاتے ہوئے تقریر ختم کی۔ کچھ اور مہمان خواتین جو کسی وجہ سے نہ آسکی تھیں
ان کے بھیجے ہوئے مضامین مختلف خواتین وطالبات نے سنائے۔

پھر کھانے کا دور شروع ہوا۔ سب کے سب ڈائننگ ہال کی طرف جانے لگے۔
اسی دوران سلطانہ آپا سے ملنے کے لئے ڈاکٹر سلطانہ خاں آگے بڑھیں۔ سلطانہ آپا

تے سلطانہ خان کی پُر مغز تقریر کو بے حد سراہا اور پھر میں نے بھی ان کو مبارکباد دی، ان کی حق گوئی پر، ان کی بے باکی پر۔ پھر سلطانہ آپا نے میرا تعارف سلطانہ خان سے کروایا کہ "یہ میری شاگرد فاطمہ تاج ہے، یہ شاعرہ ہے، ادیب بھی ہے۔"

"او! فاطمہ تاج!" سلطانہ خان نے محبت سے میرا بازو تھام لیا۔ کہا۔ "میں تمہارے مضمون ہمیشہ پڑھتی ہوں۔ تم سے ملنے کی بے حد خواہش تھی۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" کچھ ایسی محبت سے انھوں نے مجھے مخاطب کیا کہ میرے ذہن میں یہ مصرعہ گھوم گیا۔ ع

خوشبو کی طرح اُس نے پذیرائی کی میری

پھر ہمارے پاس چند گھڑی کے لئے آمنہ آپا، زینب آپا بھی رکی رہیں۔ بیگم وحیدہ ہاشم علی اختر صاحبہ میرے قریب سے گذریں۔ میں نے سلام کیا تو بہت سا پیار اور دعائیں مل گئیں۔ اچھا ہوا نا ـــ؟

پھر ہم لنچ کے لئے آگے بڑھ گئے۔ ہر چند کہ گرمی زیادہ تھی لیکن میزبانی میں احترام و خلوص کی ٹھنڈک بھی شامل تھی۔ پُر تکلف کھانے کے بعد ہم واپس جلسہ گاہ میں آگئے۔ اب یہاں کا منظر کچھ بدل گیا تھا۔ صبح سے بیٹھے ہوئے چہرے کم اور نئے چہرے زیادہ نظر آرہے تھے۔ ہم نے بھی اس بار اپنی نشست بدل ڈالی۔ مسز حامد احمد خان، ڈاکٹر بشیر النساء اور عالیہ خان کے قریب ہم بیٹھ گئے لیکن قادری آپا جو مسلسل ہمارے ساتھ تھیں وہ اس بار ذرا آگے رہ گئیں۔ تیسرا دور شروع ہوا۔ یہ دور فاطمہ عالم علی خان کی شعلہ بیانی کا دور تھا۔ مسائل پیدا کرنے والوں کے خلاف جیسے کہ تلوار چل رہی ہو یا کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو، زبانؒ ذو الفقار، الفاظ خنجر کی طرح

دل میں اُترتے ہوئے فاطمہ آپا کا ترنم لہجہ پُرجوش ہو چلا تھا۔ جوش اور ہوش دونوں کے تاثرات چہرے سے عیاں تھے جی چاہا کہ اُسی وقت فاطمہ آپا کی نظر اُتار دوں۔ ان کی تقریر کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے۔

"میری دلی خواہش تھی کہ مسلم خواتین کے مسائل پر خواتین ہی ایک جگہ جمع ہو کر کھل کر بات کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک مرد کی سوچ میں لوچ پیدا نہیں ہوتا معاشرہ میں کوئی صحت مند تبدیلی لانا ممکن نہیں۔ نہ زبردستی کی شادیاں روکی جاسکیں نہ جہیز اور لین دین پر قانون کا اثر پڑا۔ افسوس کہ اکثر مرد کی ہوس اقتدار اور خودغرضی نے طرح طرح سے عورت کو زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کی ہے جبکہ اسلام میں مرد اور عورت خود مختار اور منفرد حیثیت رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے غمگسار تھے، مرد حاکم نہیں بلکہ محافظ، سچا دوست اور چاہنے والا ہمسفر تھا۔ وہ تو نا پید ہے اب تو صرف حاکم و محکوم کا رشتہ باقی رہ گیا جو اسلام کی نفی کرتا ہے۔ عورت کی سسکیاں گھر کی چار دیواری سے ٹکرا کر اب گھر کے باہر بھی سنائی دیتی ہیں اور سننے والوں کو دعوت فکر دیتی ہیں۔"

مختلف حاضر و غائب مقررین کا سلسلہ جاری تھا اور میں اس جلسے کی اہمیت کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ میری نظر ہال میں لگی علامہ اقبال کی تصویر پر تھی اور یہ مصرعہ لب پر تھا۔ مصرعہ "وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا"

میں نے چھت پر لگے خوبصورت فانوسوں پر اک نظر ڈالی، اس کے ساتھ ہی دانشور خواتین کے چہرے بھی نظریں جم سے گئے جو علم سے روشن تھے۔ اب دو سیشن ملادیئے گئے تھے جن کی صدارت آمنہ حیدر خاں، اور مسز وہاب الدین کر رہی تھیں محترمہ فیض النساء

نے اپنے مذہب اور پیشے سے پورا پورا انصاف کرتے ہوئے وہ قانونی حل بتائے جو اسلام کی بنیاد پر بنائے گئے تھے۔ مسز وہاب الدین نے غریب طبقہ کی خواتین کی امداد اور ان کو ہنر مند بنانے کے لئے اپنا تعاون پیش کیا، پھر شمیم علیم صاحبہ نے وضاحت کرتے ہوئے کافی اُمید دلائی کہ ہمارے مسلم سماج بالخصوص خواتین کے لئے صحیح راہ کا تعین کیا جائیگا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ مصرعہ آیا۔ ؎

" اب آئی جاتی ہے منزل، اب آئی جاتی ہے "

اس کے بعد آمنہ حیدر خاں صاحبہ نے بہت ہی شائستہ و بلیغ صدارتی تقریر کی اور اس شعر پر تقریر ختم کی ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اسی دوران کئی خواتین و طالبات نے مشورے دیئے جو نوٹ کر لئے گئے۔ چھ بجنے والے تھے جلسے کے ختم ہونے کا اعلان ہوتے ہی خواتین جانے لگیں۔ واپسی میں سیڑھیوں کے پاس سلطانہ آپا نے شمیم علیم صاحبہ سے میرا تعارف کروایا کہ یہ فاطمہ تاج ہیں وغیرہ وغیرہ۔ شمیم علیم صاحبہ نے میرا ہاتھ محبت سے تھام لیا اور میں ہاتھ چھڑا کر بھاگ جانے والی بات کا تصور نہ کر سکی، پھر فاطمہ آپا نے مجھ سے کہا تاج! یہ شمیم، شگفتہ فرحت کی بہن ہیں۔ میں نے دوبارہ خوشی کا اظہار کیا اور انہیں اس کامیاب سمینار پر مبارکباد پیش کی اور دل ہی دل میں اتنے بڑے جلسے کے حسنِ انتظام کی داد دیتے ہوئے گھر واپس ہوگئی۔ --



(سیاست۔ ۱۴ر جون ۱۹۹۲ء)

لوگ میرے شہر کے

شہر کے بارونق اسی علاقے میں میرے آگے ایک لڑکا تقریباً ۱۹ یا ۲۰ سال کا چل رہا ہے اسے خبر ہی نہیں کہ اس کے پیچھے کون ہے ڈھیلا سا پرنٹیڈ شرٹ اور سیاہ بیلوں ٹائپ پتلون، سفید موزے اور سیاہ جوتے، گردن پہ لہراتی ہوئی، کسی قدر خمیدہ زلفیں، چال میں ٹھسکا، کاندھے پر ایک بیاگ بھی لٹکا ہوا ہے میں ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی کیوں کہ میں پیچھے پیچھے چل رہی ہوں نا! اس لئے میرے آس پاس بہت سے لوگ آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں لیکن میری نظر اسی لڑکے پر ہے وہ میرے بالکل سامنے چلا جا رہا ہے میری سیدھی جانب ایک لڑکی ماتھے پر بندی لگائے اپنی ساتھی لڑکی سے باتیں کرتی جا رہی ہے۔ اور بائیں جانب ایک صاحب شیروانی پہنے (جس کے بٹن بیدری کام کے ہیں) ہاتھ میں تھیلا لئے دوسرے ہاتھ سے سیکل کا ہنڈل تھامے چل رہے ہیں، میرے پیچھے بہت سے لوگوں کی آوازیں سن رہی ہوں شائد وہ لوگ اپنا کوئی پروگرام طے کر رہے ہیں یہ تو میرا اندازہ ہے ورنہ اس کی گفتگو تو اس شور شرابے میں سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور اس لڑکے سے آگے نکل آئی ذرا سی دیر میں ہی میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا گہرا سانولا رنگ

پیشانی بالوں سے ڈھکی ہوئی اور فلمی ہیرو جیسا چہرہ لئے لڑکے نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور چلتا رہا سامنے سے تین لڑکیاں علیحدہ علیحدہ خوش رنگ نسوار سوٹ پہنے چلی آرہی تھیں تینوں خالی ہاتھ تھیں ان کے بیگ نما پرس ان کے کاندھے سے لٹکے ہوئے تھے تینوں کی شکلیں معقول تھیں نہ صرف یہ کہ چلنے کا انداز بھی شائستہ تھا بلکہ نظریں بھی جھکی ہوئی سی تھیں کچھ اور خواتین بھی ان کے پیچھے آرہی تھیں شام کا وقت سیاہی میں ڈوب رہا تھا ہر طرف ٹریفک کی بدنظمی نے دلوں کی طرح راستے تنگ کر دیئے نہ چاہتے ہوئے بھی پیدل چلنے والے مقابل سے دھکا کھا جاتے ہیں۔

بسنڈیوں پر بیچی جانے والی کھانے پینے کی چیزیں صحت مند لوگوں کو چیلنج کر رہی ہیں بسوں کے خوفناک ہارن، آٹو رکشا کی کرخت آوازیں اور اس اسکوٹر کی ٹرر۔۔۔ٹرر، ساتھ ہی مختلف گاڑیوں کی آوازوں نے مہیب سناٹے کی آمد بھی پیدا کر دی ہے میں تو اس وقت ان لوگوں کو دیکھ رہی ہوں جو جاتے اور آتے رہے ہیں کسی کے چہرے پر وحشت، کسی کے چہرے پر خوشی و غم کے تاثرات ہیں مزدوروں کی ٹولیاں تعمیر کا سامان کاندھوں پر رکھے لوٹ رہی ہیں جس طرح کے شام کے وقت پرندے اپنے بال و پر بچائے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں میرے آگے والا لڑکا میرے پیچھے ہو گیا ہے میں ذرا دیر رکنا چاہتی ہوں مگر کیسے رکوں؟ کہاں رکوں؟ نہ تو [illegible] سبب ہے نہ وہ مقام جہاں میں لمحہ بھر ٹھہر سکوں! میں اپنے شہر کے ان مضطرب لوگوں کو دیکھ رہی ہوں جو بظاہر سجے سجائے نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر کی ویرانیاں صحرا سے کم نہیں۔ ان دوڑتے ہوئے قدموں پر میری نظر ہے جو بے انتہا تھک گئے ہیں۔ مگر پھر بھی چلنے پر مجبور ہیں اگر رک جائیں تو ہجوم انھیں دھکا دے کر

گرا دینے گا وہ مجبوراً چل رہے ہیں۔ میرے قریب سے غیر ملکی سینٹ کی خوشبو میں بسا ایک ہوا کا جھونکا گذرا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہاں پر اجنبی شہر کی پرچھائیاں اب بھی نظر آتی ہیں یہاں میرے شہر کی مٹی کی خوشبو اب بھی غیر ملکی خوشبوؤں پہ بھاری ہے "آنٹی!" کی آواز پر میں نے گھوم کر دیکھا وہی لڑکا جو میرے پیچھے چل رہا تھا میرے بالکل بازو میں آگیا اور مجھ سے پوچھنے لگا "آنٹی! میں یہاں گاؤں سے نوکری کرنے آیا ہوں کیا آپ میری مدد کر سکینگی؟" میں نے حیرت سے اس ہیرو لڑکے کو دیکھا آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی اور چہرے پر کہیں مسکراہٹ بھی نظر آرہی تھی میں نے اسے بتایا کہ اس شہر میں کام کرنے کے لئے ہیرو نہیں چلینگے' یہ میرا شہر ہے یہاں پر محنت کرنے والے ان لوگوں کی ضرورت ہے جو میرے شہر کی سوندھی خوشبو میں بسی فضا کو اپنے اندر اس طرح جذب کرلے کہ وہ خود مٹی کا حصہ بن جائے اور ان لوگوں کے وجود سے وہی مٹی کی سوندھی خوشبو پھوٹ پڑے جو "مٹی کے انسانوں" کے لئے اجنبی نہ ہو غیر ملکی سینٹ کی خوشبو بے اثر ہوجائے میرے شہر کے لوگ ہیرو جیسے لباس میں نہیں' تہذیب سے آراستہ ہوں ان کے قدم "ڈسکو یا بریک ڈانس" کے انداز میں نہ اٹھیں ان کے قدم محبت کی راہ میں جرأت سے چلنے والوں کی طرح ہوں جس سے امارات اور خود غرضی کے محلوں کی دیواریں دہل جائیں جن کے قدموں کی آہٹ سے سوئی ہوئی بہاریں جاگ اٹھیں' آرزوں کے پودوں کی آب یاری اس طرح کی جائے کہ بس تازہ کونپلیں ہی نظر آئیں کوئی زردی مائل پتہ ہرگز نہ ہو' خواہشوں کے شجر پر عمل کے تازہ تازہ پھول کھلے ہوں اور ان پھولوں سے بھی مٹی کی سوندھی سی خوشبو جسم و جاں کو مہکاتی رہے وہ جب کبھی "دیارِ غیر" میں جائیں تو پہچانے جائیں کہ یہ ہیں لوگ میرے شہر کے۔

--

"تسکیں کو ہم نہ روئیں....."

اکثر لوگوں میں ایک ایسی عادت ہوتی ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں، کسی کو پسند ہو تو ہو.....

اب یہی دیکھئے نا! بعض لوگ بذاتِ خود، کچھ نہیں ہوتے، اس کے باوجود کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، غیر ضروری اکڑ فوں سے گردن اُونچی کرکے پھرا کرتے ہیں، ہمیشہ لن ترانیاں، لن ترانیاں...... مشہور شخصیتوں کے نام لیتے ہوئے کہتے ہیں، فلاں سے ہمارے قریبی مراسم ہیں، فلاں معزز و نامور ہستی سے ہمارا رشتہ ہے، اہم شخصیت کا نام لے کر کہتے ہیں کہ وہ تو ہمارے قریبی عزیز ہیں، فلاں فلاں کے ہم عصر رہ چکے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

میں پوچھتی ہوں کہ رشتے دار، پڑوسی، اور دوستوں کے حوالوں کے بجائے یہ کیوں ثابت نہیں کرتے ہیں کہ "ہم بھی کچھ ہیں"؟

اپنے آپ کو دوسروں کے توسط سے متعارف کروانا قطعی غیر اہم بات ہے، مزید اُس پر فخر کرنا اور بُری بات ہے۔

آدمی کو اپنی ذات سے کچھ بننے کی کوشش کرنی چاہیئے، یہ کیا کہ دوسروں کی طرف اشارہ کرکے اپنی شخصیت کی اہمیت جتائی جائے، بھلا یہ بھی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ ہے.....؟

یقیناً وہ لوگ زیادہ قابلِ ذکر سمجھے جائیں گے جنھوں نے اپنی محنت سے اپنا مستقر و مقام بنایا ہو، بغیر کسی سہارے کے ہوش و خرد کی راہوں پر چلتے رہے ہوں، فکر و فن کے دریا، دشواریوں کے صحرا پار کر کے کھوجے جاتے ہیں۔ یہ نامناسب ہے کہ کسی کے ساتھ جا کر کنویں سے پانی بھر لائیں اور کہیں کہ ہم پانی بھر لائے ہیں خود کنواں نہ کھود سکے . . . . . ریگستانوں میں دھنسے بیٹھے آسمان کی طرف تکتے رہنا اور بارش کی دعا مانگنا قطعی زیب نہیں دیتا اور نہ یہ زیب دیتا ہے کہ گذرتے ہوئے کارواں سے پانی مانگ کر پی لیا اور دھوپ میں جلتے بیٹھے رہے۔ پانی کھوجو، پانی! سمندر کی تلاش کرو، بیٹھے رہنے سے سمندر پاس نہیں آجاتے، صحرا سے نکلو گے تو سرابوں سے بچو گے تب کہیں دریا ملیں گے۔ اپنی ذات میں وہ خوبیاں پیدا کرنی چاہئے جو کسی کی مرہونِ منت نہ ہو، خود ذات کا سمندر جتنا گہرا ہے اُتنے ہی گہر اُس میں موجود ہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ کسی بڑی شخصیت سے منسوب ہونے سے عزت مل جائے گی۔ بالکل غلط ہے، انکساری انسان کو عزت دیتی ہے، خلوص دلوں کو قریب کرتا ہے، اخلاق سے اعتماد پیدا ہوتا ہے، دوسروں کی خوشی کو اپنے دل میں محسوس کرنے سے مرتبہ بڑھتا ہے ـــــ کسی کی کامیابیوں پر بسورتے رہنا، کسی کا نام سُن کر ماتھے پر بل ڈالنا، کسی کی خوشی پر جلتے رہنا، یہ عادتیں زوال کی طرف لے جاتی ہیں اور زوال ہی فنا کی پہلی منزل ہے۔ آخر اُن جلتے ہوئے زینوں پر قدم رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جس کی بلندی راکھ کے ڈھیر کے سوا، کچھ بھی نہ ہو؟ کیا یہ بات اچھی نہیں کہ بلندی و پستی کو عبور کرنے کے بجائے مستقل راستے پر چلا جائے۔ ــ ــ

شباہتوں کی رفاقت میں

میں نیم تاریک ماحول میں تنہا اُس تخت پر ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی جو میرا بوجھ برسوں سے اُن کہاروں کی طرح اُٹھائے ہوئے ہے جو اپنے سردار کو پالکی میں بٹھائے وادیوں اور چٹانوں سے بھی گذر جاتے ہیں۔ میرے کانوں میں وہ لفظ صدائے گنبد کی طرح گونج رہے تھے، جو کچھ دیر پہلے کسی خیال نے عالمِ وجود میں آکر مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے یوں ادا کئے جیسے فقیر کی جھولی میں گہر ڈال دیئے جائیں۔

میری نیم وا آنکھوں کے سامنے دو پیکر آ کھڑے ہوئے بالکل میری طرح، ہو بہو میری طرح، فرق بس اتنا تھا کہ ایک کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہتے جا رہے تھے، تو دوسری شبیہہ کے ہونٹوں پر بڑی دل نواز مسکراہٹ دمک رہی تھی۔

میں نے اپنے مقابل ٹھہری ہوئی اِن شباہتوں سے پوچھا، کون ہو تم ؟

لبریز آنکھوں والی شبیہہ نے کہا "مجھے غم کہتے ہیں۔"

دوسری شبیہہ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا "میرا نام خوشی ہے۔"

میں نے پوچھا: تم لوگوں کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟

تو ایک نے کہا " تم سے دوستی! "

میں نے کہا " میں کسی دوستی کے قابل ہی کہاں ہوں ؟ "

تو ایک نے کہا ' کیوں نہیں ؟ تم تو ہم دونوں ہی کے قابل ہو لیکن ہم تمہیں یہ حق دیں گے کہ ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کرلو اور ہمیشہ اپنی دوستی قائم رکھو۔

میں نے کہا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں تم میں سے کس سے دوستی کروں ؟

غم نے کہا۔ مجھ سے دوستی کرلو، مجھ میں تمہاری ذات سے ہمیشہ وابستہ رہنے کی صلاحیت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ !

خوشی نے کہا، میں تم سے بہت کم ملا کروں گی لیکن جب بھی ملوں گی تم کو شادابیوں سے سنوار دوں گی، تمہیں زندگی کا احساس ہو گا ' تارِ نفس سے نغمے پھوٹ پڑیں گے ' کرلو نا مجھ سے دوستی ۔ ۔ ۔ ۔ ! (خوشی اٹھلانے لگی)

غم کی شبیہہ فوراً ایک قدم آگے بڑھ آئی ' پھر کہا ' پل دو پل کے احساس میں بھی زندگی کا کچھ لطف آسکتا ہے بھلا ؟ تمہاری تنہائیوں کو انجمن بنائے رکھنے کے لئے یہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے والے آنسو ہی اچھے رہیں گے۔

غم کی شبیہہ نے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو یوں گرایا جیسے وادیوں کا چہرہ دھونے کے لئے آبشار چلے آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں اپنی دونوں شناساؤں کے درمیاں آئینۂ حیرت بنی گُم سُم سی بیٹھی تھی، اُس گفتگو کی بازگشت میرے اندر بہت دور سے گونج رہی تھی

جو کسی نے عالمِ خیال سے وجود میں آکر کچھ دیر پہلے مجھ سے کسی نے یوں کی تھی کہ "زندگی میں تم سے اچانک ملاقات ہوئی ہے، اب تم ہمیں ہی زندگی کا یہ سفر تمام ہوگا ......!!"

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں شناساہتوں کی طرف بڑھادیئے کہ زندگی کا سفر تمام ہونے سے پہلے، تنہائیوں سے ذرا دور، غم اور خوشی کی رفاقت میں اگر دو چار قدم اور چلوں تو کیا حرج ہے... ؟... ؟... ؟

■■



گذرے ہوئے دن لوٹ کر آتے تو نہیں مگر یاد ہمیشہ رہتے ہیں گذرے ہوئے دنوں کی یاد ہی تو ہمیں زندہ رکھتی ہے، گذرا ہوا ہر لمحہ اپنے اندر مسیحائی رکھتا ہے، زندگی کے تجرباتی زخم یوں ہی مندمل ہوتے ہیں، جو حادثات کے نشتر چبھتے ہیں وہی زندگی کا احساس بھی دلاتے ہیں ......!



ستاروں سے آگے

ہم تاروں بھرے آسماں کے نیچے بیٹھے "آسماں کے ستاروں" سے سرگوشیاں کر رہے تھے' تارے ہمیں بلا رہے تھے' آنکھوں سے اشارا کر رہے تھے کہ ہم کسی کو بھی بتائے بغیر ان کے پاس چلے آئیں' کچھ تو شوق اور کچھ تاروں کا اصرار' ہم مجبور ہو گئے اور "پر" نہ رکھتے ہوئے بھی پرواز کرنے لگے تاروں بھرے آسمان کی طرف بڑا مزا آ رہا تھا ہم جس قدر آسمان کے قریب ہوتے جا رہے تھے اجالے بڑھتے ہی جا رہے تھے ان اجالوں میں ہم نے دیکھا کہ ہم ان زینوں کے قریب پہنچ گئے ہیں جہاں چڑھ کر آسمان کے بڑے سے دروازے سے ہم اندر داخل ہو سکتے ہیں ہم نے مڑ کر نیچے زمین کی طرف دیکھا اُف! کتنا اندھیرا تھا وہاں نہ جانے ہم وہاں کس طرح رہتے آئے ہیں' خیر! ہم نے زینوں پر قدم رکھا تو خود بہ خود آسمان کا دروازہ کھل گیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے ہائے' ہائے کیسا سماں تھا وہ' جگ' مگ' جگ مگ' در و دیوار فرش پر بھی جیسے نور کا دریا بہہ رہا ہو' ہمیں ایک فرشتے نے اپنے کرن جیسے ہاتھ سے مزید آگے بڑھنے کا اشارہ کیا ہم آگے بڑھے تو ایک اور زینہ نظر آیا ہم وہاں پہنچے تو دیکھا روشن سی قباؤں میں فرشتے مصروف تھے' اور اُجلی قباؤں پر سیاہ

"ایپرون" پہنے ہوئے تھے اور ننھے ننھے فولادی موتی بڑے بڑے خوانوں میں سے نکال کر ایک عجیب و غریب بہت ہی بڑی مشین میں ڈالتے جا رہے تھے اور یہ فولادی موتی دوسری طرف سے بہت ہی بڑے سائز کے ہو کر نکل رہے تھے ان موتیوں کا سائز کرۂ ارض سے بھی بڑا تھا پھر ان فولادی بڑے بڑے گولوں کو ایک طرف کونے میں رکھا جا رہا تھا جہاں نیلے، سبز، گلابی لباسوں میں فرشتے مصروف تھے وہ ان گولوں کو اپنے روشن دمکتے ہوئے ہاتھوں سے مانجھتے جا رہے تھے جیسے جیسے وہ انھیں مانجھتے جاتے وہ گولے چمکتے جاتے اور پھر انھیں ایک حوض میں ڈال دیا جاتا جس میں پانی کے بجائے روشنی جھلملا رہی تھی کچھ دیر بعد انھیں روشنی کے حوض سے نکال کر ایک پائپ میں قطار در قطار جما دیا جاتا اور اس پائپ کا رُخ نیچے کی طرف کر کے دھکیل دیا جاتا، تارے وسعتِ آسمان میں بکھر جاتے اور آسمان دلہن کی طرح سجا ہوا لگنے لگتا، ہم نے ایک انتظامیہ کے فرشتے سے آخر پوچھ ہی لیا کہ یہ سب کیا ہے؟ اور یہ ننھی منی فولادی گولیوں سے کیسے اتنے بڑے بڑے ستارے بن رہے ہیں؟ وہ فرشتہ ہمارا گائیڈ بن گیا اور اس نے ستاروں کی تاریخ ہمیں بتانی شروع کی "یہ ننھی منی فولادی گولیاں دراصل انسانوں یعنی زمین کے حاکم کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو ہیں ڈاکٹر اسی لئے فولاد وافر مقدار میں خون میں رہنا ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ آنسوؤں میں جب خونِ دل ڈھلتا ہے تو فولاد بھی بہہ نکلتا ہے آپ لوگ انھیں یہاں لے آتے ہیں وہ آنسو جو کسی کی موت پر بہائے جاتے ہیں، وہ آنسو جو عاشق اپنے محبوب کی جدائی میں بہاتے رہتے ہیں، وہ آنسو جو شدتِ درد سے بہہ نکلتے ہیں، اور وہ آنسو جو خوشی سے نکل پڑتے ہیں، وہ آنسو جو مظلوم کے ہوتے ہیں، وہ آنسو جو کسی دل سے کسی اور کی آنکھوں سے نکلتے ہیں

ہم انھیں آسمان پر لے جاکر علیحدہ کر لیتے ہیں یہ فولاد کی ننھی گولیوں کی شکل میں منجمد ہو جاتے ہیں لیکن ان میں بڑی وسعت ہوتی ہے آپ کی دنیا جیسی کئی دنیا میں ایک ایک آنسو میں سما سکتی ہیں اس لئے ہم ان کی روشنیوں کو بھی الگ الگ رنگ دیتے ہیں اہل زمین دیکھتے ہیں کہ کسی ستارہ سے سبز کسی ستارے سے گلابی، کسی ستارے سے نیلی اور کسی سے سفید روشنی نکلتی رہتی ہے اور اندھیری راتیں جگمگاتی رہتی ہیں، اب آپ ذرا اُدھر چلئے (گائیڈ فرشتے نے ہمیں ایک اور زینہ دکھایا ہم آگے بڑھے، ہماری آنکھیں اچانک بند ہوسی گئیں فرشتے نے ہماری آنکھوں پر ہاتھ پھیرا ہم نے آنکھیں کھولیں، مسکراتا اجالا ہمارے سامنے ہمیں ٹھنڈک کا احساس دلا رہا تھا ہم بھی مسکرانے لگے اور گائیڈ فرشتے کی طرف استفہامیہ نگاہ سے دیکھا، فرشتے نے کہا " یہ چاند ہے، یہ وہ چاند ہے جو اہل زمیں سے عشق کرتا ہے، زخمی دلوں کی پہنائی سے یہ واقف ہے اس لئے یہ خود بھی زخمی شکل بنا رکھتا ہے جسے آپ لوگ ہلال کہتے ہیں، رفتہ رفتہ یہ آرزو کی طرح پھیلنے لگتا ہے اور پھیلتا ہی جاتا ہے اور آخر بہت ہی حسین ہو جاتا ہے آرزو کی طرح .... مگر آرزوں کی ناکامی اسے پھر گھٹانے لگتی ہے یہ پھر رفتہ رفتہ زخم کی طرح ہوتے ہوئے اندھیرے گوشوں میں چلا جاتا ہے، آپ جسے شب دیجور کہتے ہیں۔

اب آپ اور آگے چلیں" فرشتے کے اشارے پر ہم نے چاند کو حسرت سے دیکھا، وہ بھی معصوم مسکراہٹ لئے ہم کو دیکھ رہا تھا، ہم آگے بڑھے تو وہاں کوئی راستہ نہ تھا فرشتے نے ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا اس بورڈ پر "ڈینجر" لکھا تھا ہم حیران ہو گئے فرشتے نے کہا یہاں آفتاب قید ہے بالکل اس کے ساتھ قید یوں

جیسا سلوک ہوتا ہے مقررہ وقت پر ہی اسے کھولا جاتا ہے ہم نے پوچھا یہ آفتاب کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے آفتاب تو وجہِ زندگی ہے، حرارت دیتا ہے، "شمسی توانائی" نہ ہو تو دنیا فنا ہو جائے! فرشتے نے کہا! آفتاب اہلِ زمین کے ارادوں سے ٹکرا گیا حالاں کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اس لئے اسے قید کر دیا گیا ہے اور وہ زخمی بھی ہو گیا ہے وہ اپنے زخموں کی آگ زمین پر برساتا ہے جس سے خود بخود آگ لگنے کے واقعات ہوتے ہیں، لوگ تپش کی وجہ سے بے چین ہو جاتے ہیں اگر یہ آفتاب قید نہ ہوتا تو نہ یہ چاند ہوتا، نہ یہ ستارے ہوتے، اب ہمیں کچھ گرمی سی محسوس ہو رہی تھی ہم نے گائیڈ فرشتے سے اجازت چاہی تو اس نے ہمیں ایک جھولے پر بٹھایا شاید وہ یہاں کی "لفٹ" تھی کرنوں کی ڈور سے بندھے جھولے میں ہم کو اک کیف سا محسوس ہوا، فرشتے نے ذرا دیر لفٹ روکی اور سیدھی جانب دیکھنے کو کہا، ہم نے دیکھا تو وہ ایک بہت ہی بڑا بہت ہی روشن ستارا تھا جو ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا جواباً ہم بھی مسکرا دیئے فرشتے نے کہا "یہ صبح کا ستارا ہے یہ کسی کا آنسو نہیں صرف اجالوں کا مرکز ہے شام کو جلدی نکل کر دیر سے ڈوبتا ہے" یہ اہلِ زمین کا رہنما ستارا ہے" یہ ہمیشہ مسکراتا ہے اس میں ہر رنگ کی روشنی جذب ہے یہ رات بھر جاگنے والوں سے ہم کلام ہوتا ہے اس کی سرگوشی آواز بن کر دل میں دھڑکتی رہتی ہے بہت سے لوگ اسی سے درس لیتے ہیں، اس سے حوصلہ پاتے ہیں .... پھر ہم اسی کرۂ ارض پر پہنچ گئے جہاں سے ہم اجالوں کو دیکھتے ہیں ——— اچانک ہمیں قدموں تلے نمی کا احساس ہوا، ہم نیند سے جاگ چکے تھے اور اس ٹھنڈی ریت پر ہمارے پاؤں تھے جیسے ابھی تک سورج کی شعاعیں گرما نہ سکی تھیں ————

شاعر کا کمرہ

یہ ایک شاعر کا کمرہ تھا جہاں سادگی اور سلیقے کے سوا ذرا بھی تصنع نہ تھا ذرا بھی دکھاوا نہ تھا ایک کونے میں کھڑی کتابوں سے بھری بڑی سی الماری، وہیں نیچے کچھ حصے میں فرش کیا ہوا جس پر گاؤ تکیہ بھی رکھا تھا اس کے ذرا آگے ایک تخت جس پر سلیقے سے بستر لگا ہوا تھا اس کے سامنے ایک کھڑکی جہاں نڑا سا میز جس پر کچھ کاغذات اور کرسی، بازو میں ایک سنگھار میز بھی تھا یہ کمرہ اس شاعر کی کائنات تھا جس کی فضائیں شاعر نے کبھی آزاد سانسیں لی تھیں کبھی گھٹ گھٹ کر ایک اک گھڑی گذاری تھی اس کمرے کی فضائیں شاعر کی وہ سسکیاں بھی ہیں جو کوئی سن نہ سکا وہ آنسوؤں کے نشان بھی ہیں جو کسی کے نظر نہیں آئے وہ مسکراہٹیں بھی ہیں جو خوشگوار یادوں کی دین ہیں وہ قہقہے بھی محفوظ ہیں جو کسی خاص موقع پر کبھی رسماً اور کبھی بے اختیار شاعر نے لگائے تھے، سلیقے سے سجے بستر پر بے قرار شاعر کی وہ کروٹیں بھی نظر آتی ہیں جیسے "نشکن" کہتے ہیں رات شاعر کو جگانے کے لئے آتی ہے اور دن خود کو بھلا دینے کے لئے، شاعر نے جب کسی کا نام مضطرب ہو کر سرگوشیوں میں لیا تو کمرے کے در و دیوار بھی ساکت و جامد ہو گئے کمرے کے اندر ہی نہیں باہر بھی سناٹا چھا گیا شاعر کا دل اندر ہی اندر رونے لگا سسکنے لگا۔

کوئی نہ تھا جو اسے تسلی دیتا، کوئی نہ تھا جو اسے اپنے پاس ہونے کا یقین دلاتا وہ تنہا تڑپتا رہا گردشِ دوراں کی تمام تلخیوں کو گھونٹ گھونٹ پیتا رہا۔

دیکھنے والے اسے شاعر کا کمرہ کہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بس، شعر لکھتا ہے۔ پڑھتا ہے گنگناتا ہے ہر کوئی یہ نہیں جانتا کہ شاعر انسان بھی ہے، پورا انسان جس کے سینے میں دل بھی ہے جو کائنات کے اسرار سمجھنے کے لئے بے چین ہے جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ رنج و غم کے، جدائی کے لمحے مستقل کیوں ہوتے ہیں؟ آرزو کی گھڑیاں عارضی کیوں ہوتی ہیں؟ محرومیوں کے لئے اسی کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ شاعر کا دل صدیاں گذار کر بھی یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ دل کوئی بھی آرزو کرتا ہی کیوں ہے؟ کیا زندگی کے لئے آرزو بھی ضروری ہے؟ جینے کے لئے بہانے کیوں ڈھونڈھنے پڑتے ہیں؟ شاعر کے دل میں کئی سوال سر اٹھاتے ہیں مگر اسے کہیں سے تسلی بخش جواب نہیں ملتا کوئی بھی وہ راستہ نہیں دکھاتا جو اسے منزل کی طرف لے جائے وہ تنہا بالکل تنہا اپنا وجود لئے زمانے کے الجھے راستوں پر چلتا رہتا ہے اپنی ذات کو دوسروں کے لئے وقف کر دیتا ہے جو کچھ اس کے امکان میں ہے وہ سب دوسروں پر لٹاتا رہتا ہے وہ دوسروں کو خوش کرتا رہتا ہے اپنی خوشی کی تلاش میں جو اسے کبھی نہیں ملتی، بس، آرزو کے صحرا میں سراب ہی سراب نظر آتے ہیں فریب کا لامتناہی سلسلہ شاعر کے شانہ بہ شانہ چلتا ہے شاعر کے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں پھر چھالے پھوٹنے لگتے ہیں پھر ان سے خون بہنے لگتا ہے شاعر اُف نہیں کرتا کیسے کرے؟ کس کے لئے کرے کون سنے گا اس کی آہوں کو؟ وہ تو اپنی پلکوں پر آنسو بھی نہیں آنے دیتا کہ آنسوؤں کے لئے دامن بڑھانے والا کوئی نہیں، وہ چلتا رہتا ہے، دوڑتا رہتا ہے محرومیوں

کے بگولے اسے روکنا چاہتے ہیں وہ نہیں رکتا پاؤں کے زخم گل کھلانے لگتے ہیں، صحرا لالہ زار ہونے لگتے ہیں، بگولے خوف زدہ ہو جاتے ہیں، سرابوں میں لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں ہواؤں میں ترنم گونجنے لگتا ہے ۔ شاعر کے لبوں سے آہ بن کر شعر نکلنے لگتے ہیں، بہاریں کہیں سے دبے پاؤں اس شاعر کو ڈھونڈھ لیتی ہیں شاعر نکھرا جاتا ہے، ٹھنڈی ہوا اُسے تھام لیتی ہے بارشِ دادِ تحسین میں شاعر بھیگنے لگتا ہے، فرشِ صحرا پر مسندِ گُل بچھ جاتی ہے اور پھر ------ اور پھر ------ ستاروں کے سلام آتے ہیں کرنیں شاعر کے قدم چومتی ہیں چاند سورج عقیدت سے اس شاعر کے آگے جھک جاتے ہیں اور یہ انسان جو شاعر ہے زندگی بن جاتا ہے ----- سراپا زندگی ------ مکمل زندگی ----- پیامِ زندگی

جو نفس نفس تقسیم ہوتی رہتی ہے ——— !



"حیات" کائنات میں عارضی اور کائنات سے آگے مستقل ہے، اسی لئے ہم نہ چاہتے ہوئے بھی کائنات سے آگے نکل جاتے ہیں جہاں زندگی بھیس بدل کر ہمارا انتظار کرتی رہتی ہے ۔



"خیال"

ابھی اتنا اندھیرا تھا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ صبح قریب ہے، کوئی مجھے جگا رہا تھا۔ کیسے؟ پتہ نہیں، نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں، میں نے سُنا، اُٹھو، اُٹھو بھی جاؤ!

(پھر وقفہ سے) اُٹھو نا؟

میں نے ایک "اونہہ" کے ساتھ کروٹ بدلی تو پھر آواز آئی۔ لہجہ حاکمانہ تھا۔
ارے، یہ کیا طریقہ ہے؟ اُٹھو، اُٹھو دُو ...... اُٹھ جاؤ ......

میں نے دوسری کروٹ بدل کر اپنی کاہلی کا پورا ثبوت دیا۔ اور اپنی اَدھ کھلی آنکھوں سے اُس پیکر کو لاپرواہی سے دیکھنے کی کوشش کی کچھ مدھم سا سراپا تھا، معلوم نہیں کس کا تھا، خواہ مخواہ مجھے اُٹھانے پر تُلا ہوا تھا۔

(پھر آواز آئی) اُٹھو بھی ......!

(میں نے دھتکارنے والے نفی کے لہجے میں نفرت سے کہا) اوں ہوں ...
نہیں اُٹھنا ہے؟ (حاکمانہ لہجے میں سوال بھی تھا)

(میں نے دوبارہ اپنے آپ کو تساہلی کے سپرد کرتے ہوئے بہت لد سے دیا)
اوں ...... ہوں ...... (اور ادھ کھلی آنکھیں اتنی زور سے بند کرلیں کہ مجھے لگا کہ کوئی خواب پگھل کر بہہ گیا ......!

اچھا، اب تمہیں کوئی نہیں اٹھائے گا، سو جاؤ ..... (بھرپور خفگی کا لہجہ آواز میں یاسیت لئے ہوئے تھا)

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی، آنکھیں خود بخود کھل گئی تھیں

میرے آس پاس اندھیرا ہی اندھیرا تھا، لیکن یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ صبح قریب ہے۔ میں اس پیکر کو دیکھنے کمرے سے باہر نکلی جس کی آواز نے مجھے صبح سے پہلے ہی جگا دیا تھا، لیکن یہاں تو کوئی نہیں تھا، تو پھر یہ کون تھا؟

میں نے بے خیالی میں اپنے آپ سے پوچھا، وہ کون تھا آخر......؟

(میرے وجود کے اندر کہیں سے سرگوشی سنائی دی) ....

... تمہارا ...... خیال ......!



○ بے آواز رونے والوں کی گفتگو تو سنائی دیتی ہے مگر وہ سسکیاں کوئی نہیں سنتا جو لہجے میں چھپی ہوتی ہیں ....



○ کبھی کبھی تکمیلِ آرزو کے بعد خوشی کی شدت سے مر جانے کو جی چاہتا ہے وہی لمحہ زندگی کی معراج ہوتا ہے .....!



ٹھنڈی چھاؤں

آخر زخم مندمل ہو ہی گئے، میں اب اِن زخموں کو کھروچ کر تازہ نہیں کروں گی کیوں کہ زندگی میں پہلی بار میرے زخم سوکھے ہیں، حالانکہ کئی بار میں نے اِن زخموں کا علاج کیا، تسلی کا مرہم ہمیشہ بے اثر رہا، کبھی کوئی اُمید بھی کارگر نہ ہو سکی، لیکن میں جب پوری طرح مایوس ہو گئی، بے حس ہو کر بیٹھ گئی تو میری نظر بے ارادہ اپنے پاؤں کے ان زخموں پر پڑ گئی جو نہ جانے کس طرح مندمل ہو چکے تھے اَب نہ میرے پاؤں میں جلن تھی نہ آبلے، نہ تر و تازہ خون کے قطرے . . . .

شائد یہ اِس لئے ہوا کہ میں زندگی کی دشوار راہوں پر چلتے چلتے تھک کر مایوسی کے در پر بیٹھ گئی تھی، بس ! یہ میرا بیٹھ جانا ہی اثر کر گیا۔ اب میں پھر اسی رفتار سے چلنے کے قابل ہو چکی ہوں جس طرح برسوں پہلے چلا کرتی تھی اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آگے راستے میں کہیں بھی کوئی درخت نظر نہیں آتا، کوئی دیوار بھی نظر نہیں آتی مگر لگتا ہے کہ میں کسی سائے کی پناہ میں ہوں، ٹھنڈی چھاؤں کا احساس مجھے ہر لمحہ ہے . . . . !

--

ملبے کے نیچے

ہم کبھی خوابوں میں کھو جاتے ہیں تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب بیداری کے ملبے میں دب جاتے ہیں ذرا سی آہٹ پر کھل جانے والی آنکھوں میں ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ذہن میں دھماکے پیدا کر دیتے ہیں، میں اکثر اس طرح کے راستوں سے گذرتی رہی ہوں اس لئے میں ان ہنگاموں کی عادی ہوں، لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دوسروں کے غم میں اپنی آنکھوں سے آنسو بہا سکتی ہوں، دوسروں کی مسکراہٹیں اپنے ہونٹوں پر سجا سکتی ہوں یہ سب کچھ میرے لئے صرف ممکن ہی نہیں بلکہ بہت آسان ہے مجھے راستوں کے بکھرے ہوئے پتھر اور کانٹے ہٹانے کا بڑا شوق ہے مجھے یہ احساس بڑی تسکین دیتا ہے کہ اگر میں راستہ صاف کر دوں تو آبلہ پا مسافر آرام سے اپنا سفر طے کر لیں گے یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ مسافروں کو اتنی راحت کا احساس ہو کہ وہ میرے ہموار کئے ہوئے راستے کو ہی منزل سمجھ لیں ------! ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، مگر ہونا وہی چاہیئے جو میں چاہتی ہوں۔ جو میں کر سکتی ہوں اور میں کیا نہیں کر سکتی ہے؟ دشوار راستوں کو آسان بنا سکتی ہوں ملبے کے نیچے دبے ہوئے خوابوں کو پلکوں کی سیج پر سلا سکتی ہوں، آنکھوں میں ٹوٹتے تاروں سے ماحول کو جگمگا سکتی ہوں ذہن میں ہونے والے دھماکوں کو نغموں میں بدل سکتی ہوں، دبے پاؤں چپکے آنے والی "نسیم سحر" کا تعارف، گلشن حیات سے کروا سکتی ہوں ہر گل تازہ کی تازگی کو شبنمی تحفے دے سکتی ہوں، بکھرے ہوئے کانٹوں کو ہاتھوں میں لے کر پھول بنا سکتی ہوں، مگر----- یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب میں "میں" رہ سکوں---!---!---!

تھکن

تھک گئی ہوں، بہت تھک گئی ہوں۔ ایک دو قدم بھی چلا جاتا نہیں،
میں ذات ہوں، صرف ذات، کب تک اپنے وجود کا بوجھ اُٹھا کر چلتی رہوں ....؟
میرے وجود میں کانٹوں کے جنگل پیوست ہو گئے ہیں۔ میرے وجود پر طنز کے
بھاری بھاری پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ میرے وجود پر وہ فولادی جملے بھی ہیں جو مجھے
اکثر زدوکوب کرتے رہتے ہیں۔

میری ذات ہمیشہ سہمی رہتی ہے، بہت کچھ محسوس کرتی ہے مگر اُف نہیں کرتی
میرے وجود کو سمیٹ کر زندگی کی دشوار اور تاریک راستوں پر چلتی رہتی ہے، آج اُسی
ذات کی بازگشت سنائی دے رہی ہے کہ میں تھک گئی ہوں، بہت تھک گئی ہوں،
میری آبدیدہ ذات کے آنسو میرے وجود سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں۔ لوگ یہ سمجھ
رہے ہیں کہ میں زخمی ہوں، مجھے چارہ گری کی ضرورت ہے، حالانکہ میں ابھی تک بھی
زخمی نہیں ہوں، صرف رنجیدہ ہوں، حزن و ملال کو اپنے اندر جذب کرنے کی
ناکام کوشش میں لگی ہوں، مجھے ابھی زخمی ہونے میں کافی وقت باقی ہے۔ ابھی
تو میں صرف تھکی ہوں، درد بن کر تھمی نہیں ہوں .....!!! ■■

○

"ہم خیال"

کون ہو تم ؟

تمہارا خیال !

لیکن تم مجسم کیسے ہو گئے ؟

تمہارے احساس کی بھول بھلیوں سے نکل کر ....!

کہیں لوگ تمہیں قتل نہ کر دیں ....؟

تو پھر میں تمہارے وجود میں احساس کی طرح جذب ہو جاؤں گا !

کیا یہ آسان ہو گا .... ؟؟

ہاں ہاں ، بہت ہی آسان ....!

تو اس سے پہلے کہ تم پر کوئی وار کرے تم خود کو میرے احساس میں دوبارہ جذب کر کے محفوظ ہو جاؤ نا ....!

لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم پھر مجھے نکال پھینکنے کی کوشش کرو گی ، اور میں تمہاری ذات سے ہٹ کر کہیں اور جانا نہیں چاہتا ، سمجھیں ؟

تو پھر یوں کرو کہ مجھے اپنی ذات میں سمیٹ لو ... !

نہیں ، ایسا نہیں ہو سکتا ۔ "خیال" مجسم" ہو سکتا ہے "مجسم" خیال نہیں ہو سکتا ۔ تم ہم خیال ہو سکتی ہو ، صرف ہم خیال....!...!

"دراصل"

میں نے روتے ہوئے چہرے بہت کم دیکھے ہیں زیادہ تر ہنستے، مسکراتے چہرے ہی مجھے نظر آتے ہیں لیکن اس بات کا میں دعویٰ کر سکتی ہوں کہ یہی ہنستے، مسکراتے چہرے بھی دراصل روتے چہروں کا بدل ہیں، کچھ لوگ غم کے بوجھ سے رو دیتے ہیں، تو کچھ لوگ ہنس دیتے ہیں اور یہ ہنسنے والے لوگ ہی بہت زیادہ غم زدہ ہوتے ہیں یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کا غم جانے ان پر ہمدردی کا احسان رکھے یہ اپنے آپ مسیحا ہوتے ہیں، غم کی شدت سے یہ لوگ رونے کے بجائے ہنسنے کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں وہ اپنی زخمی روح کا علاج کرنا نہیں چاہتے کیوں کہ ان کو معلوم ہے زخمی روح کا مسیحا کوئی نہیں ہوتا کسی سے بھی درماں ممکن نہیں ـــ

ایسے لوگ اپنی انا کو سمیٹ رکھتے ہیں اور خود ہی اپنا مداوا کرنے لگ جاتے ہیں ہنس کر مسکرا کر جینے لگتے ہیں، ماحول کا زہر پی کر حالات کو خوشگوار بنانے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں ـــ

یہاں تک کہ زندگی کی شام ہو جاتی ہے اور اس شام کے اندھیرے میں ہنسی کہیں ڈوب جاتی ہے ـــــ



"دِلّی یا دل ہی"....

پالم ھوائی اڈہ پر طیارہ کے پہئیے زمین کو چھو چکے تھے ادھر میرے دل کی دھڑکنیں بھی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھیں کچھ ہی دیر میں میرے قدم دلی کی دلکش زمیں پر اپنا نقش جمانے والے تھے، آخر وہ مبارک گھڑی بھی آہی گئی، طیارہ رک چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی مسافر اپنی نشستوں کو چھوڑتے ہوئے قطار بنائے دروازے کی طرف بڑے سکون سے جارہے تھے لیکن میں اپنے تخیلاتی پَروں کو پرواز سے روکنے کی ناکام سی کوشش میں لگی تھی بہر صورت میں اس وقت خیالوں سے چونکی جب میرے قدم نہ جانے کسی وقت طیارہ سے لگی سیڑھی سے اتر کر طیرانگاہ کی زمین سے جا لگے تھے .... میں نے مانوس سوندھی سی۔ خوشبو محسوس کی اور سرشاری چھانے لگی، سامان لے کر ہم ٹیکسی سے منزل کی طرف چل پڑے نقابِ شب ڈالی ہوئی دلی کا چہرہ دھندلا سا نظر آرہا تھا، پھر بھی میری نظر میں اجالے بھر آئے تھے، کسی طرح ہم فائیو اسٹار ہوٹل

پہنچے کمرہ بک گیا اور کھانا کھانے کے بعد ذرا دیر میں کھڑکیوں کے دبیز پردے ہٹا کر میں شیشوں سے باہر دیکھنے لگی لیکن آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اجالوں کے سوا کچھ نظر نہ آسکا آخر صبح کے انتظار میں آنکھ ۔۔ لگ ہی گئی ۔

ہم صبح دیر سے جاگے، میں نے اٹھتے ہی سب سے پہلے کھڑکیوں کے پردے ہی نہیں ہٹائے بلکہ شیشوں کے در بھی وا کر دئیے۔ رات نے اپنا گھونگھٹ الٹ دیا تھا صبح کا حسین چہرہ ماتھے پہ سورج کا جھومر سجائے دلی کے آئینے میں مسکرا رہا تھا، دلی کی فضا میں بسی سوندھی سی خوشبو سوئی ہوئی بھوک کو جھنجھوڑ رہی تھی پھر ہم ناشتہ کے بعد باہر گھومنے نکل پڑے، آبشاروں جیسے لہجے میں ڈھلی ہوئی اردو کی سحر انگیزی میرے کانوں میں مسلسل رس گھول رہی تھی مجھے یہ شعر یاد آگیا ؎

چمن کے ایک ہی گوشے میں ہے ہجوم بہار
یہ وہ جگہ ہے جہاں میرا آشیانہ تھا

اچانک ہوا کا بے حد معطر جھونکا میری روح تک کو مہکا گیا مجھے اپنے میکے کی یاد آگئی میرا ننھیال دلی کا تھا نانا اون کا کاروبار کیا کرتے تھے مکان، کھیت سب کچھ تھا عیش و عشرت میں گذر بسر کرنے والا خاندان وقت کے ہاتھوں لُٹ گیا، مال و جائیداد کا ذکر کیا، خاندان کا خاندان ختم ہو گیا کسی طرح میں اس خاندان کی اکلوتی نشانی تنہائی کا درد سمیٹنے کے لئے باقی رہ گئی اس خاندان کی جن کی پہچان بہادری تھی، ذہانت تھی، حُسن تھا، ان محبت کے دیوتاؤں کی میں نشانی ہوں۔ جن کی آغوش میں سر رکھ کر مستقل نیند کی آرزو ہوتی ہے ۔۔۔۔۔ یہ میں نہ

جانے کہاں پہنچ گئی۔

مجھے یاد نہیں کہ کس کس جگہ کے کیا کیا نام میرے شوہر مجھے بتا رہے تھے اور میں اپنے خیالوں میں گم، بس چلی جارہی تھی، جی چاہتا تھا کہ اس زمین کو چوم لوں جو میرے لئے گوشۂ جنت سے کم نہیں، دل کے کسی گوشے میں چھپا لوں جو میرا میکہ ہے، میری جان ہے، کوئی مجھ سے پوچھے میری دیرینہ آرزو؟ تو میں کہوں دلّی! کوئی مجھ سے پوچھے میرا پسندیدہ شہر؟ تو میں کہوں دلی! کوئی مجھ سے پوچھے حاصلِ سفر؟ میں کہوں دل ---- ھی ----

جس نے دلی نہیں دیکھی اس نے گویا ہندوستان نہیں دیکھا، جامع مسجد کے دامن میں بسے ہوئے حقیقت نما افسانے نہیں پڑھے تو اس نے کچھ نہیں پڑھا، تاریخی عمارتوں کی عظمت، ویراں ہوکر بھی برقرار رہی دلی نے بہت آنسو بہائے ہیں اس کے آنسو پونچھنے کے لئے کئی حکومتیں آئیں اور گئیں لیکن جب دلی مسکراتی ہے تو سارا ہندوستان مسکرایا ہے۔

نئی دلّی کے نئے رنگ، ڈھنگ دلی کی پرانی اخلاقی روایتوں کے آج بھی احسان مند ہیں یہ دلی نہیں ہے "دل ہی" ہے، ہے نا؟

راستہ چلتے ہوئے جب میں وہاں کی قدیم عمارتوں کو دیکھ رہی تھی تو مجھے لگا کہ یہ عمارتیں خاندان کی بڑی بوڑھی خواتین کی طرح مجھے بے تحاشہ چوم رہی ہیں اور میں اتنی بڑی ہوکر بھی ان کی کمزور بانہوں کے حصار میں "ننھی سی جان" بنی سمٹ گئی ہوں، دلی کے آسمان نے بھی مجھ پہ ایک نظر ڈالی لیکن بیا یا سمجھ کر نظر انداز کردیا، اس دلی کی زمین کشادہ دلی کے ساتھ میرے لئے پھیلی ہوئی تھی

میں تھم تھم کر چل رہی تھی جیسے کہ ماں کا ریشمی آنچل پھیلا ہوا ہو، میں میکہ سے جلد گذر جانا نہیں چاہتی تھی، میں نے پرانی دلی سے گلے ملنے کی کوشش کی مگر نئے لوگوں کا سمندر بیچ میں آ گیا میں نے دور ہی سے پرانی دلی کو خدا حافظ کہا، جواب میں پرانی دلی نے بھی آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور آنکھوں، آنکھوں میں دوبارہ آکر ملنے کی تاکید کی ۔۔۔۔۔

دلی ہندوستان کا دل ہو یا نہ ہو، لیکن یہ میری جان ہے، میری آرزو دل کا جہان ہے، میرے میکے کی حسرتوں کا نشان ہے، دلی ہی دراصل ہندوستان ہے یہ "دلی" دل ہی ہے ۔۔۔۔۔ میرا دل ۔۔۔۔!



"فرصت کے رات دن"

آج کل فرصت کے رات دن چل رہے ہیں زندگی، میدانِ عمل سے نکل کر نعروں اور "بند" کی بارہ دریوں میں براجمان ہے، موجودہ حالات شاہد ہیں کہ آج کا سماج سانس لینے میں تکلیف محسوس کر رہا ہے نہ جانے یہ ہماری مجبوری ہے یا غفلت کہ ہم عالم نزع میں ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے کمزور سماج کو آکسیجن نہیں

سے پا رہے ہیں، نظامِ شمسی میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا پھر بھی زمین و آسمان بدلے ہوئے سے لگتے ہیں۔ ہم ملک کے حالات پر نکتہ چینی کر تو سکتے ہیں لیکن اصلاح کا کوئی نظام ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کرسیوں کی چھینا جھپٹی میں لوگ اوندھے منہ گر رہے ہیں لیکن کرسی کی تمنا ترک نہیں کرتے، مہنگائی کی سنگلاخ چٹانوں سے سب ہی گذر رہے ہیں سب ہی کے پاؤں زخمی ہیں مگر کسی کو اپنے زخموں سے بہتے ہوئے خون کی پروا نہیں جھوٹی شان کے لئے دولت کے ساتھ ساتھ اپنا خون بھی بہا رہے ہیں موجودہ زمانے میں پرانی تہذیب کا ذکر تو باقی ہے مگر اس کے وجود کو تسلیم کرنے تیار نہیں، موقع بے موقع رسومات اور ضابطے کی تکمیل جیسی دشواریاں قدم قدم پر ہمیں ناکامیوں کا احساس دلا رہی ہیں۔ آج کل زندگی کے طلب گاروں نے موت سے معاہدہ کر لیا ہے اور پُرسکون لمحوں کی تجارت کرنے لگے ہیں۔ رشتے، مذہب، اخلاق اور زندگی کی کڑیاں الگ الگ ہو گئی ہیں بے حسی اس تابوت کی آخری کیل ہے جس میں ہماری تہذیب کی لاش کو رکھا گیا ہے۔ قانون کتابوں میں، مذہب دعظوں میں، حکومت کرسیوں میں اور زندگی نعروں میں بٹ گئی ہے ناقابل برداشت مہنگائی نے غریبوں کو بھوک دی ہے تو تجوریوں کو دولت، ملاوٹ کے شوق نے سانسوں کو آہوں میں سمو ڈالا ہے ہم سانس بھی صحیح طور پر نہیں لے پا رہے ہیں کبھی گھٹن زیادہ ہو تو لمبی سانس لینے کی کوشش میں ہمارے منہ سے ایک چیخ نکل پڑتی ہے اور اس کی بازگشت ہمیں خود اپنے وجود میں دُور دُور تک سنائی دیتی ہے کیوں کہ اب ہمارا وجود کسی گنبد کی طرح کھوکھلا ہو گیا ہے جب کوئی چیخ سنائی دیتی تھی تو آس پاس کے لوگ مدد کرنے کے لئے دوڑ پڑتے تھے آج قتل و خون کا بازار

اس قدر گرم ہے کہ ہر کوئی یہاں سے جلدی بغیر گذر جانا چاہتا ہے کوئی یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ کس کا سر کٹا کس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا گیا کون تیز رفتار گاڑیوں کے درمیاں آ گیا کون فٹ پاتھ پہ سردی سے اکڑ کر مر گیا کون دھوپ میں تپ کر اونچی بلڈنگ بناتے بناتے گر پڑا کس کا خاندان آگ کی لپیٹ میں آ گیا کس کا سرمایہ سیلاب میں بہہ گیا ؟ بظاہر لگتا ہے کہ آج کا انسان بہت مصروف ہو گیا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ آج کا انسان بالکل بے کار ہو گیا ہے اور فرصت کے رات دن گذار رہا ہے اور فرصت کے رات دن نہ سونے میں گذرتے ہیں نہ جاگنے میں یہ دن بس خیالوں کے سمندر میں خواہشوں کی کنکریاں پھینکنے میں گذرتے ہیں حالانکہ دریا میں کنکریاں مارنے سے لہریں تو پیدا کی جا سکتی ہیں مگر طوفان نہیں اٹھائے جاتے طوفان تو تیز و تند ہواؤں سے بپا ہوتے ہیں ۔

سنگتراش

سنگ تراش اپنے سامنے والی چٹان کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا ، مختلف زاویوں سے اس کا جائزہ لیتی آنکھوں میں بے شمار کرتوں کا عکس تھا

اس نے سوچا، کس قدر مضبوط لیکن مجبور ہے یہ چٹان، یہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی اس کے باوجود کتنی جان دار نظر آتی ہے، یہ اُف! مگر اس کی سانسیں اندر ہی اندر گھٹی گھٹی سی ہیں، لگتا ہے کہ اس چٹان میں ابھی جان باقی ہے، کیوں نہ اسے تراش کر سانس لینے کا موقع دیا جائے اسے زندگی مل جائے گی، اور پھر سنگ تراش نے اپنی چھینی سے اس چھوٹی سی چٹان کو تراشنا شروع کردیا۔ مسلسل چوٹ لگانے سے سنگ تراش کے ہاتھوں میں جلن ہونے لگی مگر وہ پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں لگا رہا۔ چٹان اب ایک ستون کی سی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ سنگ تراش کے ماہرانہ ہاتھوں کی چوٹ کے آگے بھلا چٹانوں کی بساط ہی کیا ہے؟ کرچیاں بکھری ہوئی تھیں، آس پاس پتھر بھی پڑے تھے، سنگ تراش کی زلفیں گرد آلود ہوگئی تھیں، پلکوں کے گھرے سایوں کے درمیان آنکھوں میں اُمید کے کئی چراغ روشن تھے۔ دھوپ اور چاندنی سے سنگ تراش دیوانہ وار گذر رہا تھا، ہاتھوں کے چھالے پھوٹ کر زخم بن گئے تھے، چھینی خون میں تربتر، مگر سنگتراش اپنے "کارِ جنوں" میں معروف تھا کب دن ڈھلا اور کب شام ہوئی، سنگ تراش کو کچھ خبر نہ تھی وہ تو اپنی تخلیق میں لگا تھا آخر تراشی ہوئی چٹان ایک پیکر میں ڈھل گئی یہ پیکر دونوں ہاتھ صلیب کی طرح پھیلائے کھڑا تھا جیسے اس کی پھیلی ہوئی باہوں میں سارا عالم سمٹ آیا ہو ......

سنگ تراش نے آستین سے اپنے چہرہ کا پسینہ پونچھ ڈالا اور اپنی تیز سانسوں کو درست کرتے ہوئے اس پیکر کو بغور دیکھتے ہوئے سوچنے لگا، اس میں اب بھی کوئی متاثر کرنے والی بات نظر نہیں آتی لیکن میں ایسے پُراثر بناؤں گا اتنا حسین بنادوں گا کہ سانسیں لینے لگے گی میری یہ تخلیق! پھر لوگ اس کی پوجا کریں گے

اور پھر سنگ تراش نے چھوٹی سی چھینی سے چہرہ تراشنا شروع کیا اس نسوانی پیکر کا چہرہ پتھر کا ہو کر بھی پھول جیسا لگنے لگا، اس کی آنکھوں میں سنگ تراش نے جنگ جیتی ہوئی کیفیت کا احساس سمویا تھا، اس کے تناتحانہ تبسم نے اس کے ہونٹوں پر مچلنا شروع کر دیا تھا اس کا ٹھہرا ہوا صلیب جیسا انداز زندگی کی اہمیت کا احساس دلا رہا تھا۔ سنگ تراش نے اس کے سر پر ایک تاج بھی سجا ڈالا تھا جیسے وہ کسی سلطنت کی بے تاج ملکہ ہی ہو، سنگ تراش اپنی تخلیق کو دیکھتا رہا، خوش ہوتا رہا وہ مطمئن ہو گیا تھا، اس کی شہکار تخلیق اس کی کامیابیوں کی دلیل بنی اس کے سامنے تھی، سنگ تراش پلکیں جھپکائے بغیر اپنی تخلیق کو دیکھ رہا تھا، اچانک اس تخلیق میں جان آگئی۔ تخلیق نے ایک انگڑائی لے کر لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے اور چل کر اپنے خالق کے قریب آنے لگی، سنگ تراش ساکت و جامد کھڑا رہ گیا، تخلیق اس کے سامنے آکر جھک گئی اور کہنے لگی، میرے خالق! حیران کیوں ہو رہے ہو؟ تم نے ہی تو مجھے بنایا ہے، نہیں، نہیں میں نے تمہیں تراشا ہے، صرف تراشا ہے، جان نہیں ڈالی تم میں .... خالق نے بری ہونا چاہا، نہیں میرے خالق! تم نے نہ صرف مجھے تراشا ہے بلکہ تم نے ہی مجھ میں جان بھی ڈالی ہے، تمہاری اپنی جان، دیکھو تو یہ لہو لہو ہاتھ، یہ تہہ بہ تہہ گرد میں اٹا ہوا تمہارا وجود، یہ پریشان زلفیں، سب گواہ ہیں کہ تم ہی میرے خالق ہو، تم ہی میرے خالق ہو، تمہاری جان مجھ میں آگئی، خالق کی پہچان اس کی تخلیق سے ہوتی ہے نا؟ میرے خالق! دیکھو تو میں کس طرح جی اُٹھی ہوں؟ تمہاری روح کا ایک سرا میرے پیکر سے بندھ گیا ہے دوسرا سرا تمہارے

وجود میں ہے ہم ہیں سے کوئی ایک مرکھی جائے تو ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکے گا خالق نہیں رہے گا تو تخلیق اس کی یاد دلاتی رہے گی، اور اگر تخلیق مٹ گئی تو خالق کی ہر سانس تخلیق کو محسوس کرتی رہے گی، سنگ تراش یہ سب سنتے ہوئے بت کی طرح کھڑا کا کھڑا رہ گیا آنکھیں پتھرا گئیں مگر تخلیق کا عکس اب بھی ان آنکھوں میں نمایاں تھا، تخلیق عقیدت سے اپنے خالق کے قدموں میں بیٹھ گئی بالکل بے جان بت کی طرح جس کا سر جھکا ہوا تھا ۔۔۔۔

آسمان سے ٹوٹتے ستارے تو سب ہی دیکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ دیکھ چکے تھے دو کرنیں زمین سے آسمان کی طرف جا کر ایک ستارہ بن گئی تھیں ۔۔۔۔۔۔!



سُن تو لے میری فریاد

مجھ سے کچھ لوگوں نے پوچھا ہے خاص طور پر ایک دوست نے کہ میں صرف شخصیتوں پر ہی کیوں لکھ رہی ہوں؟ تو عرض کرنا یہ ہے کہ پہلے میں "کتابِ آدم" کے چند ورق پڑھنا چاہتی ہوں تاکہ میں سمجھ سکوں کہ "بنی آدم" آخر شئے ہے کیا۔۔۔؟ جس کے لئے کائنات بنی، بڑی پُر اسرار کائنات بنائی گئی، ایسے ایسے راز

پنہاں سے "جامِ کائنات" بھر دیا گیا کہ "چھلک جائے تو مئے ہے نہ چھلکے تو پیمانہ"
اور پھر شخصیتوں پر زیادہ دھیان دیتی ہوں اس کے لئے شخصیتوں کو پڑھنے کا شوق
بھی جنون کی حد تک ہے نا، یہ نہیں کہ میں دنیا سے بے گانہ ہوں بلکہ دنیا کی
شئے میں جو حقیقت پوشیدہ ہے اسے جاننا چاہتی ہوں، سمجھنا چاہتی ہوں، پڑھنا
چاہتی ہوں جیسے کہ پھول، پتھر، پہاڑ، صحرا، سمندر، ہوا کے کبھی ٹھنڈے کبھی
گرم تیور، پیاسی زمین، جل تھل زمین، غضبناک آسمان، مہربان آسمان،
دور تک اڑنے والے پرندوں کی پرواز کا سبب، دور ہو کر بھی قریب نظر آنی والی
سورج کی کرنیں، شوخی ستاروں کی، سحر چاندنی کا، پیالۂ شب کی تہہ میں جما
ہوا دبیز اندھیرا، ہمیشہ ایک دوسرے کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے والی موجیں
موسموں سے بے خبر آبشار، زمین کو کروٹ نہ بدلنے دینے والے طاقتور پہاڑ،
پرسکون جھیلیں، جہاں زندگی ذرا دیر رک کر سکون کی سانس لیتی ہے، رنگ برنگے خواہ
مخواہ کھلکھلا پڑنے والے پھول، سہمی ہوئی سی معصوم کلیاں، بے وجہ دشمنی
مول لینے والے کانٹے، در در کی ٹھوکروں کا احساس دلانے والے راہ میں پڑے
ہوئے پتھر، گھنے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے سائے، خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ
جانے والے دامن کے تار، صحرائیں دور تک تنہا تنہا سے نقشِ قدم، زندانوں
میں بجتی ہوئی زنجیروں کا شور، مقتل میں کچھ تازہ بہ تازہ لہو کے نشان، وہ اونچے
بام و در جو فلک سے سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں، زمین بوس کچھ نادار سے بیکر،
کرسی پر بیٹھے ہوئے عجیب سے ہیولے، اور .... اور بھی بہت کچھ ہے اب
بھلا میں کیا کیا بتاؤں ؟ زندگی مختصر اور کام بہت، شخصیتیں تو دنیا میں بہت سی

بکھری ہوئی ہیں اس بساطِ عالم پہ زندگی بے شمار رنگوں میں رقصاں ہے اور اس ماحول کے ارتعاش میں سب کچھ لکھنا میرے تو بس کی بات ہی نہیں، کبھی انگلیاں کانپ جاتی ہیں تو کبھی دل اچھل جاتا ہے کبھی صفحات بکھر جاتے ہیں یا تو کبھی لفظ دھندلا جاتے ہیں وہ لوگ اور ہی ہوتے ہیں بلکہ خاص طور پہ بنائے جاتے ہیں جو ساحل پہ رہ کر بھی تہہ کے موتی گن لیا کرتے ہیں، مجھ جیسے لوگ تو صرف لہریں ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں طلاطم کا اندیشہ ساکن سطح دیکھ کر بھی کم نہیں ہوتا، یوں لگتا ہے کہ کوئی تہہ میں سویا ہوا طوفان "نقابِ آب" سے باہر نکل پڑے گا پھر بھی مجھ جیسے لوگ طوفان سے ڈرتے نہیں بلکہ ان سے سمجھوتہ کر کے طوفان کا ہی ایک حصہ بن جاتے ہیں آنے والے ساکت لمحوں کا استقبال ایسے ہی تو کیا جانا چاہیئے نا ـــــــ ـــ ؟

★

"بیان گرمی کا"

آگ برساتے آسمان اور شعلے اگلتی زمین کے درمیان بھی ہم بڑی شان سے جی لیتے ہیں اور کیوں نہ جئیں ؟ ہم پانی اور مٹی سے جو بنے ہیں، پانی اور مٹی کے

سامنے بھلا آگ کی حقیقت ہی کیا ہے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو پسینے کے ساتھ ساتھ ہم بھی بہہ نکلتے، حرارت، زندگی کی علامت ہے، درجۂ حرارت چاہے کتنا ہی بڑھ جائے لیکن ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے، ویسے بھی دیکھئے نا "گرمیٔ حیات" گرمیٔ بزم، شعلہ بیانی، شعلہ صفت، شعلہ رو جیسے لفظ پڑھتے پڑھتے اب ہم اتنے تپ چکے ہیں کہ کندن ہوا ہی چاہتے ہیں، گرمی کے موسم میں ہر شخص چاق و چوبند ہو جاتا ہے، بھئی گرمی کا موسم ہے ذرا جلدی آفس چلے جائیں تو اچھا ہے ورنہ دھوپ تیز ہو جائے گی " دیکھئے! خود بخود "آدمی کام کا" ہو گیا نا؟ واپسی ذرا دیر سے ہوگی ذرا دھوپ ڈھل جائے تو اچھا ہے کہہ کر آپ اپنے آفس میں بہت ہی اصول پسند ہو کر کام میں لگ جاتے ہیں، گرمی کے موسم میں ہی تو سال بھر کے کام انجام پاتے ہیں نا؟ اور پھر شہر کی سڑکوں کے کنارے رنگ برنگے شربتوں کے لبریز گلاس، جسے دیکھتے ہی "شاعرانہ میخانے" آنکھوں کے آگے گھوم جاتے ہیں ذرا سی دیر کے لئے تشنگی کا احساس ہوتا ہے کہ "شعر" ہم پر برس پڑتے ہیں۔ ابتدا میں تو تربوز، خربوزے کے علاوہ انگور و انار جیسے جنتی میوے ذرا دیر کے لئے ہمارے ذہن سے جنت کی وہ راہیں بھلا دیتے ہیں جن پر ہم پیدا ہوتے ہی چلنے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔

رہی "آئس کریم" تو خدا بھلا کرے ہماری نیت کا کہ ہمارا دل کبھی نہیں بھرتا پیٹ چاہے کتنا ہی بھر جائے پھر بھی آئس کریم کا نام سنتے ہی ہم باغ باغ ہو جاتے ہیں اور پھر قربان جایئے قدرت کہ جس نے ایسے شدید موسم گرما میں ہمیں موگرے کے پھول دئے ہیں سر میں موتیا کے گجرے، ہاتھوں میں گجرے

صراحیوں کی گردن میں گجرے، ہم تو باورچی خانے میں بھی یہ خوشبودار پھول رکھ دیتے ہیں کہ ہر کھانے پینے کی چیز مہکتی رہے اور ہمیں "احساسِ بہار" ہر لمحہ ہوتا رہے۔

گرما کی صبح بڑی مستانی ہوتی ہے نسیم کی خوش خرامیوں سے ہم ہمیشہ مستفید ہوتے رہے ہیں اور جب تک زندہ رہیں گے ہوتے رہیں گے، کڑی دوپہر میں اجالوں کا سپہ سالار یعنی کہ سورج جب ہم پہ وار کرنے لگتا ہے۔ تو ہم اپنے دفاعی نظام پر عمل کرنے لگتے ہیں کھڑکیوں اور صحن پر لگی خس کی چلمن چھڑک کر پانی ڈال دیتے ہیں اور خوشبودار، ٹھنڈی فضا میں اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں اگر بجلی وفا کرے تو ہم ایر کولر اور ایر کنڈیشنڈ کا استعمال بھی کر لیتے ہیں اور اس طرح ماحول کو ٹھنڈا کر لیتے ہیں، نتیجتاً آفتاب بھی اپنے غیض و غضب کے بھنور سے نکل کر ٹھنڈا ہونے لگتا ہے اور پھر ------ شام زمین پر اتر آتی ہے شنجرفی رنگ کی شام "آتشِ شوق" کی طرح منعکس ہو جاتی ہے یوں لگتا ہے کہ آسمان نے گویا زمین والوں سے اعلانِ جنگ کر دیا ہو، جو گرم ہوا دن بھر چلتی ہے وہ سرِ شام کچھ دیر کے لئے بند ہو جاتی ہے جیسے کہ بجلی بند ہو جاتی ہے، ہمیں گھٹن کا احساس ہونے لگتا ہے، ہاتھوں میں جاپانیوں کی طرح ہم بھی ادائے ناز سے پنکھا جھلنے لگتے ہیں گھر کے ہر فرد کے ہاتھوں میں پنکھا نہ ہو تو کبھی ہم اردو میگزین یا اخباروں سے کام چلا لیتے ہیں، اردو رسالوں کی ہوا میں بڑی ٹھنڈک اور خوشبو ہوتی ہے بالکل ماں کی گود کی طرح' ہے نا!

پھر شام، رات میں ڈھلنے لگتی ہے جس کا اعلان آسمان کا وہ پہلا ستارہ کرتا ہے جو ہمیں چاند سے پہلے نظر آتا ہے پھر رفتہ رفتہ اندھیرے بڑھتے جاتے ہیں۔

لیکن گرمی کا احساس کم کم ہونے لگتا ہے کھلے آسمان پر بہت سے ستارے جگمگاتے ہوئے چاند کے چہرے سے نقاب ہٹا دیتے ہیں اور ہم موسم گرما کی اس کیف آور چاندنی میں نہا جاتے ہیں ۔ نہ جانے کب ہماری آنکھ لگ جاتی ہے ہم جاگتے اس وقت ہیں جب ہمیں آموں کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے، ذرا سی یادِ الٰہی کے بعد ہم آموں پر ٹوٹ پڑتے ہیں کہ گرمی موسم کا یہی تو سب سے لاجواب تحفہ ہے ، ہے نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟



گوشۂ دل

دل ہی نے انسان کو انسان بنایا ہے دل ہی نے شعور کی راہوں پر چلنے کا موقع دیا، دل ہی تو ہے جو صاحبِ دل کو دشتِ الم میں سرگرداں رکھتا ہے، دل ہی تو ہے جو انسان کے ہونٹوں پر تبسم کی کلیاں کھلاتا ہے دل ہی تو ہے جو ایسے کارنامے انجام دیتا ہے جسے آپ اپنے غور و فکر کا نتیجہ کہتے ہیں دل ہمیشہ آپ سے تعاون کرتا ہے لیکن آپ کبھی کبھی اس کی قدر نہیں کرتے آخر وہ سرکشی پہ آجاتا ہے شکوے شکایات رنج و غم میں ڈوبنے لگتا ہے اور آپ کو اس قدر مضمحل کر دیتا ہے کہ آپ آہ بھی نہیں کر سکتے انسانوں کے چہرے شناخت کے لئے ہوتے ہیں لیکن دل کی پہچان صرف اس کی دھڑکن ہے جسے زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کسی

شاعر نے کہا ہے ؎

دل ہے ایک ہی لیکن نام دل بدلتا ہے
سج گیا تو گلشن ہے لُٹ گیا تو صحرا ہے

لیکن دل کو سمجھنا اور لٹانا کسی کے بس کی بات نہیں، دل خود مختار ہے ہر دل الگ الگ نوعیت سے دھڑکتا ہے، ہر دل کی زبان الگ ہوتی ہے کسی کا دل علامہ اقبال کی طرح وحدانیت کے نغمے سناتا ہے تو کسی کا دل غالب کی غزل گنگناتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہیں امجد کی رباعی سے مسحور ہو جاتا ہے تو کہیں جوش کے کلام کی طرح پرجوش ہو جاتا ہے علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکہ اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل

اس سائنسی دور میں دل پر بہت کچھ ریسرچ ہوا ہے اور ہوتا ہی جا رہا ہے دل حضرت انسان سے کہہ رہا ہے ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

مرزا غالب نے بھی دل پر غلبہ پانے کی بہت کوشش کی مگر وائے ناکامی! آخر انھوں نے گھبرا کر کہہ ڈالا ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

اب یہ کیا کم ہے کہ دل کے تار بدلے جانے لگے ہیں نغمۂ حیات کی لَے بھی بدل گئی ہے

پھر بھی دل بہر حال دل ہی ہے، وہی مرکزِ زندگی، وہی مشقِ چارہ گری، انسان آج بھی دل پر قابو پانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے اس کی رفتار اور آواز پر کڑی نظر رکھنے کے باوجود انسان ابھی تک اس کی وسعت کا اندازہ نہیں لگا سکا دل ہی دراصل "اک مشتِ آب و گل" ہے یہ تصویرِ انساں کا وہ پہلا نقطہ ہے جسے مصور نے سب سے پہلے تخلیق کیا اور تارِ حیات سے ایک پیکر کے ساتھ ملا کر جوڑ دیا، اور پھر انسان کا وجود نمودار ہوا جو اپنی ذات کے اندر کائنات کے تمام اسرار سمیٹے ہوئے تھا جہاں فرشتوں کے سر جھک گئے زمین و آسمان نور میں نہا گئے، آب اور خاک کا یہ عکس اس قدر تابناک تھا، اس قدر تابناک تھا کہ قدرت کو خود اپنی تخلیق پہ بے ساختہ پیار آ گیا قدرت نے اپنی تمام نعمتوں کے دروازے کھول دیئے مصور نے اپنی تصویر کو چوما، اور اس کے کئی عکس ماحول پر چھا گئے پھر عمرِ طویل عطا کر کے اسے اس فرشِ زمین پر چھوڑ دیا جس کی تخلیق اس حسین پیکر کے لئے ہی ہوئی تھی اُسے سمجھایا گیا کہ کیا کرنا کیا نہیں کرنا ہے، آگ بنائی گئی مگر جلنے سے روکا گیا، سمندر پیدا کئے گئے مگر ڈوبنے سے روکا گیا، حادثے ایجاد ہوئے مگر بچنے کی تدابیر سکھلائی گئیں دل عطا کیا گیا لیکن دل کی ہر بات ماننے سے روکا گیا۔ دل "دنیا میں کشمکش کے عالم میں ہے کیا کرے کیا نہ کرے، اپنے مصور کو دیکھنے کے بعد دنیا میں آتے ہی وہ اپنے مصور کو ذرا دیر کے لئے بھول گیا، کئی حسین و جمیل پیکر تراشے، پیکرِ انسانی میں ڈھلے اس تخلیق سے وہی سجدے طلب کر رہے تھے جو انسان کے وجود کے اندر محفوظ تھے وہ سجدے جو صرف دل سے کئے جاتے ہیں وہی بارگاہوں میں قبول ہوتے ہیں مگر حضرتِ انسان کو اپنی جبیں پر ثبت کی گئی بندگی کی مُہر نظر نہیں آتی، کئی

سجدے اصنام کی نذر ہو گئے، دل کے بدل جانے کے امکانات ہمیشہ تلوار کی طرح انسان کے سر پہ لٹکتے رہتے ہیں پھر بھی دل نے ایک سجدہ بچا ہی لیا اپنے خالق کے لئے دل کا گوشہ گوشہ تجلیوں سے معمور ہو گیا، انسان رشتوں سے تو سب کا ہو جاتا ہے مگر دل سے وہ ضرور اپنے خالق کا ہوتا ہے صرف اپنے خالق کا۔ باوجود تیرہ شبی کے دل جگمگاتا ہے اور بزمِ حیات کو روشن رکھتا ہے دورِ خزاں ہو یا موسمِ بہار دل اپنی مرضی سے کھلتا اور مرجھاتا ہے چونکہ ایک فطری امر ہے دل مجبور نہیں ہے اختیار رکھنے والی شئے کا نام ہے "دل"۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے دل پر ہمارا اختیار ہے، زندگی کے مختلف موڑ پر جب کبھی ہم کوئی ایثار کی منزل پر آتے ہیں تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ صرف ہماری کوشش کا نتیجہ ہے ہم ہی اس کے ذمہ دار ہیں اور بہت فخر سے زندگی کے ان راستوں کو دیکھتے ہیں جن کی دشواریوں کو ہم نظر انداز کرتے ہوئے ایثار کی منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے اس سفر کی کامیابی کا سبب ہمارا رہنما ہے

وہ رہنما جسے ہم "دل" کہتے ہیں وہ ہمیں اس مقام پہ لے جاتا ہے جہاں ہم خوشی سے جانا ہی نہیں چاہتے، لیکن دل دشوارئی راہ سے گذرنے پہ ہمیں مجبور کر دیتا ہے اور اس سفر میں ہمیں تشنگی کا احساس نہیں ہونے دیتا، صحرائے زندگی میں کشمکش کے سرابوں، اور ناکامیوں کے بگولوں کا سامنا کرتے ہوئے بالآخر دل ہمیں امیدوں کے سرسبز و شاداب گلشن میں لے ہی آتا ہے زندگی کے سفر میں انسان کی آبلہ پائی ایک حقیقت ہے لیکن دلِ پُر اُمید ہمیشہ شبنمی فضاؤں کو باقی رکھتا ہے اس لئے ہم اپنے پاؤں کے زخموں کو اہمیت نہیں دے پاتے اور اپنے دل کے ہمسفر ہو جاتے ہیں

کبھی یہ دل بے اختیار بھی ہو جاتا ہے "انا الحق" کی صدا گنبدِ دل سے نکل کر زبان تک آجاتی ہے دنیا والے کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے اسے دار پہ لے آتے ہیں دل اپنے اندر اپنے خالق کے عکس کو رکھے ہوئے ہے اس خزانے کی طرح جس کی تلاش میں کئی صحرا لالہ زار ہونے آئے ہیں پیکرِ انسانی فنا کی منزل سے گذر جاتا ہے اور دل اپنے خالق کے باقی ہونے کی گواہی دیتے ہوئے چپ چاپ خاموش تماشائی بنا رہتا ہے دل کے اندر تو وہی تجلی ہے جس کی زد میں آکر طور خاک ہوا تھا اس مشتِ خاک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنے خالق کا مکان ہے اور اپنے مکیں کو اپنے اندر چھپاتے ہوئے ہمیشہ روشن رہتا ہے، اپنے خالق کے دربار میں جب لوٹتا ہے تو اس مشتِ خاک کا استقبال نور سے کیا جاتا ہے ایک نورانی پیکر کے اندر سجا ہوا یہ مشتِ خاک نگینہ بن کر جگمگانے لگتا ہے، عرش تا فرش، نور ہی نور ـــــــ





"محبت" وہ خزانہ ہے جو نہ لوٹا جا سکتا ہے اور نہ ہی تقسیم کیا جا سکتا ہے اس میں کبھی کمی نہیں ہوتی، مگر محبت حل ہوتی ہے تو صرف سلوک میں حل ہوتی ہے۔



اَندھیرے اُجالے

اندھیروں سے نکل کر جب ہم روشنی میں آتے ہیں تو ذرا دیر کے لئے دنیا بڑی اچھی لگتی ہے لیکن اجالوں میں وہ سکون کہاں جو اندھیروں میں ہوتا ہے، خاموشی ہی خاموشی، تسلی ہی تسلی، کسی بھی شئے کے ہونے نہ ہونے سے بے خبر ہم بحر سکوت میں غرق ہو جاتے ہیں یہ سکوت کبھی غم کا احساس دلاتا ہے تو کبھی خوف کا! لیکن اندھیرے میں ہر احساس عارضی ہوتا ہے، صرف سکوت ہی غالب رہتا ہے اور ہم آخر اس سکوت میں جذب ہو ہی جاتے ہیں۔ اجالے ڈھونڈنے کے لئے بڑی مشکلوں سے گذرنا پڑتا ہے، اجالوں کو وجود میں لانے کے لئے بار بار چراغ جلانے پڑتے ہیں جنھیں تیز ہوائیں ہمیشہ بجھانے پر تلی رہتی ہیں، لیکن اندھیرے؟۔۔۔۔۔

اندھیرے اپنی ذات کا عکس ہوتے ہیں، اپنے وجود کے اندر سے باہر آ کر یہ وسعت اختیار کر جاتے ہیں، یہ ہمیشہ ہمیں پناہ دیتے ہیں، اندھیروں سے کوئی نہیں جلتا اجالوں سے سبھی جل جاتے ہیں۔۔۔۔۔!

▲

چاند تارا

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آج عید کا چاند سب کو نظر آیا میں نے لاکھ کوشش کی

مگر مجھے چاند نظر نہیں آیا، مجھے صرف وہ تارا نظر آیا جو میرے سامنے آسمان پر بالکل اکیلا تھا اور کچھ یوں جگمگا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ "آج ایک دن اہمیت ہے اس چاند کی ذرا دیر، خوشی کے لئے اس کے بعد تو پھر سب کو میری ہی ضرورت ہوگی سمت کا تعین کرنے کے لئے، وقت کا احساس کرنے کے لئے، .... کتنا ناسمجھ ہے یہ ستارا، بھلا منزل پہ پہنچنے کے بعد کہیں راستے کا تعین ہوتا ہے کیا ہے کیسے ضرورت پڑتی ہے رہنمائی کی ؟......؟

▼

"وجودِ زن"......

علامہ اقبالؔ نے کہا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

لیکن کائنات کو رنگ دینے کے بعد اس "نامراد تخلیق" کے پاس رہتا کیا ہے ؟ خالق کی مصلحت وہی جانے لیکن یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مذہبی سہولتوں کے باوجود عورت کو اس کا مقام نہیں دیا گیا، سماج کے اصولوں نے عورت کی اہمیت کا اعتراف تو کیا ہے لیکن قدر ذرا بھی نہیں کی، "عورت" بے گھر، بے نام بے تعلق سمجھی جاتی ہے" اس کا اپنا کچھ نہیں ہوتا، کچھ بھی تو نہیں ہوتا، گھر ہوتا ہے تو باپ کا گھر ہوتا ہے، اس کے

بعد شوہر کا گھر ہوتا ہے اور اس کے بعد بیٹے کا گھر ہوتا ہے وہ ازل سے بے گھر، بے آسرا ہے۔ پابندیاں اسی کے لئے ہیں، محرومیاں اسی کے لئے ہیں، غم اسی کے لئے ہیں۔ تکلیفیں اسی کے لئے ہیں، سب کچھ دیتے رہنے کے باوجود اسے کبھی کچھ نہیں ملتا



"جائزہ ایک مُسافر کا"

وہ لوگ جن کا، سفر جاری ہے وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ سفر کب تک جاری رہے گا؟ اور یہ لوگ کبھی کسی چھاؤں میں دم لینے کے لئے رکتے بھی نہیں بلکہ ٹھنڈی چھاؤں بھی یہ لوگ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ان کی ذات دوسروں کے لئے چھاؤں بن جاتی ہے دوسروں کو راحتِ سفر بخشتے ہوئے یہ لوگ چلتے رہتے ہیں انھیں اپنے سفر میں اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنی راہروں کی منزل بن چکے ہیں، کتنے رہنما ہیں جو ان کی نشاندہی کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ راستے جہاں سے ان کا گذر ہوتا ہے بے چراغ ہونے کے باوجود روشن ہوجاتے ہیں راستوں کی روشنی ان کی کامیابیوں کی دلیل ہوتی ہے ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی یہ تمام منزلوں سے گذرتے جاتے ہیں ان کے نقشِ قدم تقدیر کی طرح جگمگاتے رہتے ہیں ان کا مسلسل سفر شکستہ پا لوگوں کو بھی حوصلے دیتا ہے اور

شوقِ سفر، شکستہ پائی پر بالآخر غالب آجاتا ہے روشن راستوں پر مسافر بے خوف و خطر چل پڑتے ہیں نہ رہزنی کا کھٹکا ہوتا ہے نہ گمرہی کا ڈر، اور سفر جاری رہتا ہے
یہ لوگ دراصل وہ ہیں جن کا آسمانوں سے نزول ہوتا ہے زمین پہ رہنے والوں کو پرواز کی تربیت کے لئے قدرت انھیں ان کے پاس بھیجتی ہے جو "اسیرِ جبر" ہوتے ہیں پر تو رکھتے ہیں مگر اختیار نہیں رکھتے مجبور کی کبھی کوئی منزل نہیں ہوتی اور جن کی منزل نہیں ہوتی وہ سفر کے معنی بھی نہیں سمجھ پاتے یہ مسلسل سفر میں رہنے والے لوگ ہی انھیں سفر کا دستور بتاتے ہیں اور دوسروں کو بھی دعوتِ سفر دیتے ہیں کہ اسی میں حوصلہ ہے، سرفرازی ہے" خود اپنی کردار سازی ہے، بے مثال انداز اور مخصوص رفتار سے سفر کرتے ہوئے منزلوں سے گذرتے ہوئے بھی یہ لوگ مطمئن نہیں ہوتے"



تاج کی طرح

دھواں دھواں سے منظر کے درمیاں اچانک میرے آگے والا وہ منظر بدل گیا جیسے لوگ بڑے شوق سے دیکھنے کے لئے آتے ہیں، میں اسی محل نما مزار کی اُجلی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی کہ۔۔۔۔۔ سفید بڑے بڑے پروں والے ایک فرشتے نے اپنا سر بستہ کشکول میرے آگے کرتے ہوئے کہا" تاج ! مجھے تمہاری روح چاہیئے۔۔

میں حیران رہ گئی، کوئی روح کی بھی بھیک مانگتا ہے بھلا؟ میں نے کہا، میں اپنی روح تمہیں نہیں دے سکتی یہ بہت زخمی ہے، یہ جنبش بھی نہیں کر پاتی، اور فرشتے! بھلا تم میری روح لے کر کیا کرو گے؟ یہ بہت بے قرار رہتی ہے، بالکل سیماب کی طرح تمہارے ہاتھ نہ آسکے گی فرشتے نے کہا، میں اسے قرار دوں گا، اسے اس کشکول میں ڈال کر اپنے دامن میں چھپا لوں گا، ٹھنڈی چھاؤں میں اسی کے زخم بھر جائیں گے زمانے کی تپش اسے پریشان نہ کر سکے گی، تاج! دے دو نا مجھے اپنی روح ---! فرشتے کی سبز آنکھیں فضا کو رنگین کر رہی تھیں، میں نے آنکھیں دکھائیں خبردار! جو دوبارہ کہا، روح تم کو دینے کے بعد میرے پاس کیا رہ جائے گا؟ میرے پیکر کا سارا حسن ختم ہو جائے گا جب حسن ختم ہو جائے گا تو میری کہانی کیسے بنے گی؟ میری کہانی میں کرب کے سیلاب نہیں ہوں گے، آرزوؤں کی آندھیاں نہیں ہونگیں، محرومی کی بجلیاں نہیں ہوں گی احساس کا کوئی بھی موسم نہیں ہوگا، روح تم لے جاؤ گے تو میرے پیکر کی پہچان بھی ختم ہو جائے گی، میرا نام تک بھی لوگ بھول جائیں گے میری داستاں ادھوری ہو جائے گی غم اور خوشی کے درمیاں جو فاصلے ہیں اور بھی بڑھ جائیں گے، اشک آنکھوں میں امڈ کر نہ آسکیں گے، دل ذرا سی بات پر زور سے دھڑک نہ سکے گا، زندگی کا چراغ بجھ جائے گا، فرشتے! تم چلے جاؤ، میری روح کو میرے پاس رہنے دو، مجھے پریشان مت کرو، جاؤ نا؟ میں خالی ہاتھ لوٹ جاؤں؟ فرشتہ اداس ہونے لگا، تم تاج ہو تمہیں سب حاصل کرنا چاہتے ہیں اور میرا یہ کشکول کوئی نہیں لینا چاہتا، میں اس لئے اپنا کشکول تمہاری روح سے بھر لینا چاہتا ہوں تاکہ میری قدر کی جا سکے میں فرشتہ ہو کر بھی انسان

کے مرتبہ کو پا سکوں، لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ تاج کی روح سے بھرا یہ کشکول کس قدر حسین اور کس قدر عزیز ہوتا ہے ---- بالکل تاج کی طرح ----

◆

گفتگو

ہے لو ؟ ہے لو ؟ ؟ (سوالیہ اور تیز لہجہ)

ہلو ! (یقین کے ساتھ)

کیا ہے یہ ؟ میں کتنی دیر سے منتظر ہوں ؟ (شکایت)

ارے ! تو مجھے کیا معلوم ؟ (صفائی پیش کی گئی)

تم کو معلوم ہونا چاہئے (تاکید)

خیر، اب تو بات ہو رہی ہے نا ؟ (ہتھیار ڈال دئے گئے)

تمکو معلوم ہے مجھے دہلیز پر بیٹھنے کی عادت ہے ؟ (سوال پھر ہوا)

ہاں ! سو تو معلوم ہے، اور یہ بھی کہ چراغ بھی جلائے رکھتے ہیں (اعتراف کیا گیا)

تو پھر اتنی دیر سے تنہا ہوں، منتظر ہوں، بات کیوں نہیں کی ؟

(جرح شروع ہو گئی)

بات نہ کرنے کی ساعتیں گذر گئیں، اب مخاطب ہوں، فرمائیے ! (اطلاع دی گئی)

تمہاری بھی تو باتیں اچھی لگتی ہیں (لہجہ نرم ہوگیا)

صرف باتیں اچھی لگنے سے کچھ نہیں ہوتا، باتوں کا مقصد بھی ہونا چاہیئے (بات وزن دار تھی)

بہت سے مقصد ہیں کوئی بات بے کار نہیں ہوتی، ہے نا؟ (دلیل کے ساتھ پھر سوال ہوا)

سو تو ہے مگر مجھ سے بکواس ہوتی رہتی ہے، آپ یقیناً بور ہوتے ہوں گے (اندیشہ)

نہیں، بخدا، نہیں مجھے تمہاری باتیں اچھی لگتی ہیں (یقین دلایا گیا)

آپ پھر راستے سے ہٹنے لگے ہیں (یاد دہانی کی گئی)

اچھا تو لو، ہم واپس اپنی جگہ آجاتے ہیں (بات مان لی گئی)

کل کی تیاریوں میں مصروف ہوں کام زیادہ ہے (!!!)

اس لئے تم سے بات کرنے کو جی چاہا (وجہ بتائی گئی)

تاکہ کام چوپٹ ہوجائے (جواب بے ساختہ ہنسی کے ساتھ تھا)

نہیں، بالکل نہیں تم سے بات کرکے طبعیت ہلکی ہوجاتی ہے (اطمینان کا اظہار کیا گیا)

اور ہم دن بھر کا سفر آسانی سے طے کر لیتے ہیں (!!!)

اونہہ، پھر فضول باتیں ---- (احتجاج)

نہیں، یہ فضول نہیں خدا کی قسم یہ سچ ہے، بالکل سچ، (پھر یقین دلایا گیا)

اچھا تو پھر ---- ؟ (بات ختم کرنی چاہی)

بات کرو، کچھ دیر اور --- (اصرار ہوا)

مجھے کام ہے ---- (عذر پیش کیا گیا)

اچھا تو جاؤ تمہاری مرضی (مجبور لہجہ)

چلوں ؟ (سوال)

رائٹ (جواب)

خدا حافظ (!!!)

خدا حافظ (!!)

آخر میں سوال وجواب دونوں ایک تھے۔۔۔۔ !

سائبان

آفتاب ایک ایسا چراغ ہے جس کے نیچے اندھیرا نہیں تپش ہوتی ہے۔ اتفاقاً چلتے چلتے مجھے ایک سائبان نظر آیا میں ذرا دیر رک گئی، میں نے لمبی لمبی سانسیں لے کر زندگی کو محسوس کیا، اچانک زوردار ہوا کا جھونکا وہ سائبان لے اڑا، میں اب رک کر کیا کرتی ؟ میں پھر چلنے لگی، آفتاب اب بھی میرے سر پر ہے، روشنی چبھ چبھ کر آنکھوں کو زخمی کر رہی ہے، بس اندھیروں کی تلاش میں چلی جا رہی ہوں وہ اندھیرے جو مجھے محفوظ کر سکیں، کاش ! میں سلگتی ہوئی ساعتوں سے بچ جاؤں، احساس

کی چنگاریاں مجھ سے سہی نہیں جا رہی ہیں، جگہ جگہ آبلے، جگہ جگہ زخم، یہ زخم اتنے زیادہ ہیں، اتنے زیادہ ہیں کہ مسیحا کی مسیحائی یقیناً بے فیض ہو جائے گی۔

شاید سفر تمام ہونے کو ہے، راستے تنگ ہونے لگے ہیں، مگر جہاں راستہ ہو ضروری نہیں کہ وہیں منزل ہو، محرومیاں مجھ جیسے لوگوں کو ملی ہیں منزلیں ان لوگوں کو جو ------- ! !

محرومیوں اور منزلوں میں بس اتنا ہی فرق ہے، محرومیاں ہمارے پاس خود آتی ہیں اور منزلوں تک ہمیں چل کر جانا پڑتا ہے، محرومیوں کے لئے سفر کرنا نہیں پڑتا وہ خود ہماری راہ ڈھونڈ لیتی ہیں، منزلوں کے لئے بہت دشوار سفر کرنا پڑتا ہے، کبھی منزل مل جاتی ہے کبھی صرف منزل کے نشان ہی نصیب میں آتے ہیں۔

میرا ماضی بھی منزل کے نشان کی طرح ہے اور میں اپنے ماضی کو پانے کے لئے دیوانہ وار سفر کر رہی ہوں، حالاں کہ یہ بات ثابت ہے کہ ماضی وہ مقام ہے جہاں سے سفر شروع ہوتا ہے اسی لئے تو وہ پیچھے رہتا ہے اگر ماضی "منزل" ہوتا تو سفر مشکل کیوں ہوتا

اب جب کہ سفر تمام ہونے کو ہے، راستہ تنگ ہوتا جا رہا ہے خوابوں کے تمام دروازے کھل گئے ہیں میں آخری بار اِن دروازوں کے اندر دیکھ رہی ہوں یہاں چاندنی سے بھی اجلا اور نسیم سے بھی ٹھنڈا اجالا ہے بہت سے لوگ شاہی لباس میں فوجی انداز میں ٹھہرے ہوئے ہیں، ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار ہے، درمیان میں ایک اونچا سا تخت رکھا ہے جس پر شیشے کی گنبد میں ایک لعل و گہر سے سجا "تاج" بہ حفاظت رکھا گیا ہے، یہ تلواریں بھی اسی کی حفاظت کے لئے ہیں لیکن کوئی بھی شخص اس تاج کو پہننے کے لئے تیار نہیں کیوں کہ اس تاج کے نیچے کانٹے بھی لگے ہیں

اور پھر تاج پہننے کے لئے سر جھکانا بھی پڑتا ہے اور شاہی لباس پہنتے ہوئے لوگ سر نہیں جھکاتے ہاں، مگر اس تاج کے سامنے ایک بوسیدہ کپڑوں میں بیٹھے ہوئے فقیر کا سر جھکا ہوا ہے، یقیناً یہی جھکا ہوا سر تاج کے قابل ہے، فقیر تو کانٹوں پر بھی سو جاتا ہے اس لئے تاج میں لگے کانٹوں سے اسے تکلیف نہ ہوگی اور یہ احساس ہوتا رہے گا کہ اس کے سر پہ تاج ہے۔۔۔۔۔۔۔ تاج۔۔۔

اب تلواروں والے ہاتھ ایک دوسرے پر اٹھ رہے ہیں، سر کٹنے لگے ہیں، تلواریں ٹوٹنے لگی ہیں، فقیر کے ہاتھ میں تلوار ہے، نہ جسم پر زرق برق لباس، سب اس کو نظر انداز کر گئے ہیں، فقیر کا جھکا ہوا سر لمحہ بھر کے لئے اٹھے گا اور تاج اس کے سر پر آجائے گا، پھر فقیر کا راج ہوگا، تلواریں گر جائیں گی، سر جھک جائیں گے۔

زوردار ہوا نے خوابوں کے دروازے بند کر دیئے، میرے سر کی چادر بھی اڑ گئی میں تپشِ آفتاب سے پگھلنے لگی ہوں۔۔۔۔ کاش! میں کسی دل میں منجمد ہوگئی ہوتی ـــــ!

▲

"خضر اور حیات"

ایک آواز :- خضر! .... خضر... خضر.. ٹھہرو تو

دوسری آواز :- ارے! کیوں آواز دی تم نے؟

پہلی آواز :۔ تمہیں روکنے کے لئے!

دوسری آواز :۔ کیوں روکا مجھے؟

پہلی آواز :۔ تمہارے ساتھ چلنے کے لئے

دوسری آواز :۔ میرے ساتھ کون چل سکتا ہے بھلا؟

پہلی آواز :۔ ہیں، میں چلنا چاہتی ہوں تمہارے ساتھ!

دوسری آواز :۔ تمہارے قدم میری طرح مضبوط نہیں ہیں

پہلی آواز :۔ میں تمہارا سہارا لے لوں گی

دوسری آواز :۔ میں حیات کے ماروں کو سہارا نہیں دے سکتا

پہلی آواز :۔ میں حیات کی ماری نہیں ہوں

دوسری آواز :۔ اگر تم حیات کی ماری نہ ہوتیں تو مجھے روکتیں کیوں؟

پہلی آواز :۔ مجھے تمہارے ساتھ دائمی سفر کرتے رہنے کا شوق ہے۔

دوسری آواز :۔ اونہہ، تم نے مجھے باتوں میں الجھا رکھا ہے، مجھے جانے دو

پہلی آواز :۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟

دوسری آواز :۔ دیکھو تو، حیات گذری جا رہی ہے اور مجھے حیات کے ساتھ چلتے رہنا ہے۔

پہلی آواز :۔ خضر! کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا، میں ہی تو حیات ہوں دیکھو نا؟ ۔۔۔۔

~~~
~~~

لمحوں کے انتظار میں

ہم کچھ لمحوں کے انتظار میں صدیاں گذار دیتے ہیں اور یہ بے نیاز لمحے دبے پاؤں آکر پاس ہوتے ہوئے یوں گذر جاتے ہیں جیسے کوئی انھیں قید کرنے کے لئے جال بچھائے بیٹھا ہو،

بالکل میری طرح ......

●

دامن میرا

اکثر لوگوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کا دامن خالی ہے انھیں دنیا سے کچھ نہیں ملا اور ایسا ہوتا بھی ہے لیکن میں ایسا نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کچھ نہیں ملا کیوں کہ میرا دامن ہرگز خالی نہیں ہے میرے دامن میں بہت سے نکیلے پتھر ہیں جو میں نے راہ چلتے ہوئے اپنے دامن میں ٹھوکریں کھانے کے بعد اٹھا کر رکھ لئے وہ کانٹے ہیں جو چمن کا اہم حصہ ہوتے ہوئے بھی چمن سے نکال پھینکے گئے میں نے انھیں بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے جب میں کانٹے سمیٹ رہی تھی یہ کانٹے میرے ہاتھوں میں چبھ گئے، میرے خون کے قطروں

سے ان کانٹوں کو میں نے رنگ دیا کانٹے بھی حسین نظر آنے لگے اور یہ جو نکیلے پتھر ہیں نا ہے جن سے ٹھوکریں کھا کھا کر میرے پاؤں زخمی ہوئے وہ بھی میرے ہی خون سے رنگین ہو گئے ہیں پھول تو حسین ہوتے ہی ہیں میں نے پتھر اور کانٹے بھی حسین بنا ڈالے ہیں میرے دامن میں بھی حسین چیزیں میں نے چھپا رکھی ہیں یہ الگ بات ہے کہ دامن بوسیدہ ہو گیا ۔۔۔ اتفاق سے ۔۔۔۔

احساس

میرے سامنے جو راستہ ہے وہ بالکل سیدھا نہیں ہے لہراتا ہوا یہ راستہ بڑا عجیب ہے میں یوں ہی چل پڑی، جب میں چلنے لگی تو یہ راستے کے پیچ و خم مجھے بالکل سیدھے دکھائی دئے اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ راستہ بالکل سیدھا ہے میں چلتی ہی گئی اور راستے کے آخری سرے پر پہنچ گئی میں نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن یہاں سے وہ راستہ پھر بل کھاتا دکھائی دیا جسے میں "شوقِ سفر" میں سیدھا سمجھ کر بے خوف چلتی رہی تھی ۔۔۔ ۔۔۔ !۔۔۔!۔۔۔!

خواہش

ہنستے گاتے خود کو خوش رکھتے ہوئے میں پتھریلی چٹانوں پر چلی ہوں، پتھریلی چٹانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا مگر میرے پاؤں زخمی ہو گئے میں ان زخموں کی جلن سے بے چین ہوں اور خواہش ہے کہ میں شبنم آلودہ ہریالی پر کچھ دیر چلوں تاکہ میرے پاؤں کے زخموں کو ٹھنڈک کا احساس ہو، اس کے بعد تپتے ہوئے صحرا کا سفر باقی ہے صحرا جہاں ختم ہوتا ہے وہاں تک تو میں نہ پہنچ سکوں گی مگر تپتے ہوئے صحرا میں مجھے چلنا تو ہے ۔۔! میں راستے میں کسی ریت کے طوفان کی زد میں آکر ریت میں دفن ہو جاؤں گی یا صحرائی بگولوں کے حصار میں جا کر اڑ جاؤں گی مگر میں اس سے پہلے شبنم آلودہ ہریالی پر چلنا چاہتی ہوں ۔۔۔۔



میں اور زندگی

میں لق و دق صحراؤں سے گذرتی چلی جا رہی تھی تیز دھوپ مجھے جلا تو رہی تھی مگر میں خاک نہ ہو سکی تھی مجھ میں ابھی حوصلہ تھا، ہمت تھی ۔ اچانک ایک موڑ آیا ۔ بڑے حسین پھول کھلے تھے صحرا کا اختتام اس سرسبز و شاداب موڑ پر ہوا تھا میں نے سکون

کی ایک سانس لی صرف ایک ہی سانس ...... اور پھر اس موڑ سے آگے نکل گئی مگر یہ کیا؟ وہ موڑ پھر ایک گھنے جنگل پر جا کے رک گیا تھا جہاں صرف ببول کے درخت تھے گوکھرو کے کلنٹے فرش پر بکھرے تھے، بانس کے درخت کہیں اُگ آئے تھے اور نہ جانے کہاں کہاں سے لمحہ بھر میں نکلنے والے تھے میری آگے بڑھنے کی عادت مجھے روک نہ سکی میں تار تار پیرہن کی پروا کئے بغیر اپنے زخموں کی پروا کئے بغیر بڑھتی چلی جارہی ہوں، تاحدِ نظر خاردار جھاڑیاں اندھیرا کئے ہوئے مجھے خوف زدہ کرنے کی ناکام کوشش کررہی ہیں سناٹا روح میں گونجنے لگا ہے لیکن میرے قدموں تلے ٹوٹنے والے کانٹوں کی آواز اس سناٹے میں کلیوں کے چٹخنے کی صدا سے کم تو نہیں کوئی آواز تو ہے جو مجھے میرے وجود کا احساس دلاتی ہے، زندگی مجھ سے دُور جارہی ہے لیکن میں تو زندگی کی طرف جارہی ہوں وہ مجھے ملے نہ ملے مجھے میرے وجود کا احساس ہے یہی کیا کم ہے میرا وجود زندگی کے لئے ہو یا زندگی میرے وجود کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا ---- ہرگز نہیں ------!

●

ہم سفر

میں جب بھی گھر سے باہر نکلتی ہوں یا بالکنی میں بیٹھ کر سڑک کا نظارا کرتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ اِتنی بھیڑ، اتنے سارے لوگ جو چل رہے ہیں کہاں جارہے ہیں ہر راستے پر ہجوم ہے کوئی پیدل چل رہا ہے تو کوئی سواری کے ساتھ مگر ہر شخص آتا

ہے ہر طرف نئے چہرے جو دوبارہ کبھی دکھائی نہیں دیتے آخر یہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟ میں بچپن سے یہ سوچتی آئی ہوں کہ یہ اتنے سارے لوگ اپنی رفتار سے زمین کو گردش دے رہے ہیں کسی کے بھی چہرے پر وہ تھکن نظر نہیں آتی جو منزل پر پہنچنے کے بعد ہوتی ہے کسی کا سفر طویل ہے تو کسی کا مختصر، ہر عمر کے لوگ سفر میں ہیں ہر طرح کے لوگ سفر کر رہے ہیں۔ قدرت نے یہ ایک ایسا مشترکہ عمل عطا کیا ہے کہ نہ چاہنے پر بھی لوگ چلتے رہنے پر مجبور ہیں نہ راستے ختم ہوتے ہیں، نہ منزل نظر آتی ہے جب کبھی میں چہل قدمی کی خواہش مند ہوتی ہوں، باہر نکلتی ہوں تو یہ سوچ کا زاویہ کچھ بدل جاتا ہے اور میں بھی سفر کے محور پر گھومنے لگ جاتی ہوں اور یہ سوچتی ہوں کہ کیسے پاگل لوگ ہیں، میں بھی سب کے ساتھ چل رہی ہوں لیکن اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی ہوں اگر کوئی رک کر مجھ سے میرا نام ہی پوچھ لیتا تو کیا جاتا اس کا پتہ پوچھنے پر تو ظاہر ہے میں مجبور نہ کرتی میں اپنا صرف نام بتا دیتی۔۔۔ ہم۔۔۔ سفر۔۔



سایہ اور وجود

کچھ لوگ سائے کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے چاہے وہ خود ان کا اپنا ہو یا دوسروں کا مگر میرے نزدیک سائے کی بڑی اہمیت ہے سایہ وجود کا ثبوت ہے ہم کو ہمیشہ وجود کا احساس دلاتا ہے روشنی میں نظر آتا ہے، اندھیرے میں نظر نہیں آتا، مگر وہ

ہوتا ضرور ہے ہمارے وجود کے ساتھ، ہمارا رفیق ہمارا سچا دوست، جو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا ہے کبھی آگے کبھی پیچھے، کبھی دائیں، کبھی بائیں ہمارے بغیر وہ جنبش بھی نہیں کرتا ہم ٹھہر جائیں تو وہ بھی ٹھہر جاتا ہے ہم چلنے لگیں تو وہ بھی چلنے لگتا ہے اسے روشنی کی نوعیت سے واسطہ نہیں چاہے روشنی سورج کی ہو یا چراغ کی اسے تو ساتھ رہنا معلوم ہے کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سایہ ہمارے اندرونی احساس کا مظہر ہو جاتا ہے اور ہمارے وجود سے بھی بڑا نظر آتا ہے۔ میں نے کئی بار یوں بھی دیکھا ہے کہ سایہ دوہرا بھی ہو جاتا ہے میں اس دوہرے سائے کے دوسرے وجود کو ڈھونڈھنے لگی ہوں نہ جانے وہ کون ہے؟ جو میرے وجود کے سائے کے ساتھ سایہ بن کر میرے آگے آجاتا ہے نہ جانے وہ کون ہے۔۔۔؟۔۔۔ کون ہو سکتا ہے وہ؟



ہم جب بکھرتے ہیں

ماضی کی تپش ہمیشہ حال کی برف کو پگھلا دیتی ہے یادوں کے دریا بہہ نکلتے ہیں سیلاب آنے لگتے ہیں، موجوں کی زد میں آنے والی ہر شئے بہہ نکلتی ہے لیکن احساس کی چٹانیں ذرا بھی جنبش نہیں کرتیں وہ اپنی جگہ جمی رہتی ہیں بپھرتی موجوں کے تیور سے لطف اندوز ہوتی ہیں، پھر سیلاب کے بعد ماحول نکھر آتا ہے احساس کی چٹانوں پر حالات کی کرنیں رقص کرنے لگتی ہیں کبھی اس رقص کا انداز بڑا دلفریب

ہوتا ہے اور کبھی بہت ہی وحشت ناک، رقص کرتے ہوئے حالات تھک جاتے ہیں لیکن احساس کی چٹانوں کو کچھ نہیں ہوتا وہ بس تماشہ دیکھتی رہتی ہیں۔ رقص، سیلاب، غم اور خوشی کی ساعتیں ان پر سے گذرتی رہتی ہیں اور ہم اس احساس کی چٹانوں کو دل کے اندر چھپائے رکھتے ہیں کبھی کبھی دل کو زوردار ٹھیس لگتی ہے تو یہ چٹانیں مرتعش ہو کر ٹوٹنے لگ جاتی ہیں ہمارے وجود کے اندر زلزلہ آجاتا ہے، ہر شئے تہس نہس ہوجاتی ہے ہم اپنے آپ کو سمیٹے ہوئے پھر احساس کی چٹانوں کو بھی سمیٹنا چاہتے ہیں مگر ہم بکھرتے ہی جاتے ہیں ہم اپنے آپ کو نہیں سمیٹ سکتے۔ ہمیں کوئی دوسرا سمیٹ لیتا ہے کوئی بھی ..... ؟ کوئی بھی ..... ؟

صدیوں کے بعد بھی

میں صدیوں سے اپنی روح کو اپنے جسم کے اندر سمیٹے ہوئے کبھی پتھریلی کبھی کانٹوں بھری راہوں پر چل رہی ہوں، چلتی جارہی ہوں یہ کیسا راستہ ہے جس کا نام زندگی لکھا گیا ہے حالات کے سنگِ میل خوشیوں کی نشاندہی تو کرتے ہیں لیکن وہ راستہ نظر نہیں آتا جہاں پھولوں کی طرح تر و تازہ خوشیاں بکھری ہوئی ہوں، کچھ نم نم سی فضا میں مہک، دبیز بادلوں کی طرح سایہ فگن ہو، رنج والم کے دیو پیکر سائے تقدیر کے مرمریں مجسمے پر چھائے ہوئے اندھیروں میں اضافہ ہی کررہے ہیں۔ میں جب

بھی امیدوں کے چراغ روشن کرتی ہوں یادِ مخالف کے جھکڑ چراغوں کی لو کو اور خوف زدہ کر دیتے ہیں اور ان چراغوں کی لو کانپنے لگ جاتی ہے۔

میرے ساتھ ان دشوار راہوں پر کئی جسم اپنی اپنی روح کو اپنے اندر سمیٹے چل رہے ہیں سب ہی کے پاؤں زخمی ہیں سب ہی کے جسموں پر خراشیں ہیں لیکن کسی کی روح میری روح کی طرح زخمی نظر نہیں آتی ہیں سب مسافروں سے الگ ہوں بالکل مختلف ہوں کیوں کہ میری روح بھی زخمی ہے بہت زخمی ہے، اس مہین دامن کی طرح جسے خار دار جھاڑیوں میں پھنسنے کے بعد کھینچ کر نکالا گیا ہو۔۔۔۔

یہ زخم اگر جسم پر ہوتے تو مندمل ہو سکتے تھے لیکن صدیوں کے بعد بھی روح کے ان زخموں کا علاج کچھ بھی نہیں۔۔۔۔ کچھ۔۔ بھی۔۔ تو۔۔ نہیں۔۔۔



شفق

شفق کے بارے میں مختلف لوگ مختلف رائے رکھتے ہیں کسی نے معشوق کے حنائی ہاتھ اور اپنے خونِ دل سے تشبیہ دی ہے، کسی نے محبوب کے لبِ لعلیں یا رُخسارِ آتشیں کہہ کر دل ٹھنڈا کیا ہے، کسی نے موسمِ گُل کے عکس کو آئینۂ فلک پر دیکھا ہے لیکن اس قتلِ آفتاب کے منظر کی حقیقت بہت کم لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں یہ شفق اس لمحے کا نام ہے جب دن تھک کر کروٹ بدلتا ہے اور رات کی گہری سیاہ زلفوں میں منہ چھپا کر گردشِ دوراں سے بے خبر سو جاتا ہے اور پھر جب دوسری

کروٹ بدلنے کا وقت آتا ہے تو شب کا خمار آنکھوں میں بسا ہوتا ہے دوسری کروٹ افق کی دوسری سمت لیتے ہوئے دن اپنی خمار آلود آنکھوں کے آگے طلعتِ خورشید دیکھ کر انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھتا ہے سارے عالم کو بیداری کا پیغام دیتے ہوئے مسکرانے لگتا ہے ؎

وہ رنگِ شفق خواب تھا جیسے

طوفانی بادل

طوفانی بادل جب بھی گذرتے ہیں زمین کو جل تھل کر دیتے ہیں تپشِ آفتاب سے دہکتی ہوئی زمین سرد ہو کر رہ جاتی ہے! موسمِ بہار کا استقبال کرنے تیار ہو جاتی ہے اس کے باوجود ان طوفانی بادلوں کا بھیانک پن کم نہیں ہوتا برسنے کے باوجود وہ بھرے ہی رہتے ہیں مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب ان کا گذر ہوتا رہتا ہے بادلوں کا رنگ بدلتا ہے، زمین کے موسم بدلتے ہیں لیکن ان بادلوں کا نام اور تاثیر نہیں بدلتی یہ ہر دور میں ہر مقام پہ اپنی انفرادیت پر قائم رہتے ہیں یہ بھرے ہوئے بادل کبھی خالی نہیں ہوتے ہمیشہ ان کا سفر جاری رہتا ہے۔ بوند بوند طوفان لئے یہ بادل آفتاب و مہتاب کا کفن بنے رہتے ہیں کہکشانی منظر معدوم ہو جاتے ہیں یہ طوفانی بادل زمین پہ کبھی کبھی سیلاب لے آتے ہیں جس میں سرمایۂ حیات ہی نہیں زندگی بھی بہہ نکلتی ہے ---- !

بادل میرے خیالوں میں

میں اپنے بچپن میں اپنی چھت پر سے آسمان پر بادلوں کو دیکھتی رہی ہوں اس زمانے میں عجیب طرح کے بادل تھے بڑے بڑے سفید بالوں اور پروں والے پیکر، جیسے کہ فرشتے ۔۔۔۔ کبھی تو قطار در قطار چلے آتے کبھی تنہا، تنہا جیسے کہ کوئی بھٹکا ہوا مسافر ۔۔۔۔

مجھے ان بادلوں میں کئی کہانیاں بھی نظر آئیں جو تصویروں کی طرح آسمان پر پھیلی ہوئی تھیں جن میں کرنوں کا رقص بھی تھا ستاروں کی انجمن بھی، بدرِ کامل کی نورانی قبا بھی اور دلوں کو گرمانے اور ماحول کو پگھلانے والا "رُخِ آفتاب" بھی۔ بادل ہمیشہ بھیس بدلتے رہتے ہیں کبھی تو بھورے پیرہن لہراتے ہیں تو کبھی سفید درویشی عبا پہنے ہوئے ہوتے ہیں کبھی سرمئی دامن سمیٹے ہوئے تو کبھی گہری سیاہی میں ڈوبے ہوئے اور کبھی تو یوں شفق کے گلے لگ جاتے ہیں کہ شفق ہی کے رنگ کے ہو جاتے ہیں غروبِ آفتاب کے تیر سے سارا منظر زخمی ہو جاتا ہے رفتہ رفتہ بادلوں کے قافلے بڑھتے چلے آتے ہیں اور شام سے گلے مل کر ظلمتوں کے دامن میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی ان ہی بادلوں میں، میں بھی کھو جایا کرتی تھی میں خود اپنے آپ کو بادل سمجھ کر آسمان پر اڑنے لگتی تھی وہاں سے زمین کا منظر سہانا لگتا تھا نیچے بہت نیچے زمین ہوا کرتی تھی میرے قدم بادلوں کی دبیز تہہ پر آگے بڑھتے چلے جاتے تھے میں زمین کو حقارت سے دیکھا کرتی تھی ۔۔۔۔ ہونہہ ۔۔۔۔ پاگل کہیں کی بس گھومتی رہتی ہے

میرے ساتھ اگر بادلوں کی دنیا میں آتی تو پتہ چلتا کہ یہ جہاں کیسا ہے ؟ مگر اس زمین کو اپنے ذروں سے اتنی محبت ہے کہ وہ کہیں نہیں جاتی اس کی اسی ضد سے بادل کے تیور بدل جاتے اور وہ برس پڑتے ۔ زمین بڑی نرمی سے مسکرا دیتی میری طرف دیکھ کر کہتی دیکھو ! کیسے بادل ہیں یہ اک ذرا سی بات پر برس پڑے ۔۔۔۔ یہ کبھی قائم نہیں رہتے مجھے دیکھو ہمیشہ سے ایک ہی طرح ہوں ـــــ !



ایک کتاب کا تحفہ ملنے پر

الفاظ کا بوجھ ہر کسی سے اٹھایا نہیں جاتا کچھ لفظ ہوتے ہی ہیں اتنے وزن دار کہ بے چارا نحیف و ناتواں دل یہ بار نہیں اٹھا سکتا، لرز جاتا ہے، رو پڑتا ہے وزن فولاد کا ہو یا کندن کا وزن ہی ہوتا ہے، جن لفظوں کے ہم مستحق نہیں وہی الفاظ ہمارے وجود پر سجے ہوئے خوان کی طرح رکھ دیے جاتے ہیں ۔ کبھی کبھی دنیا میں بڑے ہی اعلیٰ ظرف لوگ مل جاتے ہیں جو اپنی خوشی دوسروں کو خوش رکھ کر پوری کرنے میں لگ جاتے ہیں ایسا صرف اتفاق سے ہی ہوتا ہے عام طور پر کبھی نہیں ہوتا۔ میرے اوپر بھی ایک ایسا بوجھ آپڑا ہے جن لفظوں کو مجھ میں سہنے کی تاب نہیں وہ لفظ مجھے اعزاز کے طور پر دیئے گئے ایک کتاب کے تحفہ کے ساتھ مجھے وہ القاب بھی بخشے گئے جن کی میں کسی طرح حقدار نہیں ! پھر بھی میں خود کو ڈھارس دے رہی ہوں کہ

بڑے لوگوں کے دیئے ہوئے لقب سے میرا مرتبہ بڑھ گیا ہے دنیا سے مجھے کیا؟ جس نے سرفراز کیا ہے وہ خوش ہے مجھے اس پر یقیناً فخر کرنا چاہیئے ہو سکتا ہے میں کبھی اس قابل ہو ہی جاؤں ۔

اس کے باوجود ناقابل و نااہل اپنی اس ذات کو میں نے ابھی زیادہ خوش ہونے سے روک دیا ہے کیوں کہ ۔

احسان کہاں پھولوں پہ شبنم نے کیا ہے
یہ جرم بھی اک دیدۂ پر نم نے کیا ہے

کتاب کا یہ نایاب تحفہ میرے ہاتھ میں سوالیہ نشان بنا ہوا ہے ۔

منزل ہے بہت دور ابھی آخرِ شب کی
اس سوچ میں ہوں میں کہ ابھی شام ڈھلی ہے

آتش فشاں

میں نے اپنے آپ کو ایثار کے وسیع میدان سے خواہشوں کے زنداں میں قید کر لیا تھا، اچانک مجھے گھٹن کا احساس ہوا، میں باہر نکل آئی اور دور تک چلتی رہی یہاں سرسبز و شاداب فضائیں سامنے ایک چھوٹی دار خوب صورت پہاڑ جیسے

نازسے سر اٹھائے مجھے دیکھ رہا تھا میں بھی اس کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔۔ میری تابانی نگاہ تھی یا اس پہاڑ کی کمزوری کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور پہاڑ کی چوٹی بیں شگاف پڑ گیا پھر گرم گرم راکھ کے بھنور فضا میں چکرانے لگے گرد و غبار کی چادر میں شادابِ منظر چھپ گیا، گرم ہوائیں چلنے لگیں غالباً برسوں سے لیل و نہار کے غم سہتے ہوئے گھٹتے ہوئے پہاڑ نے لمبی لمبی سانسیں لینی شروع کیں اچانک ایک دھماکہ ہوا جو پہلے دھماکے سے بھی زیادہ زوردار تھا اور پھر جیسے کہکشاں زمین پر اتر آئی ہو اور تاروں کی اس بارش کے ساتھ ہی گرما گرم لاوا ابلنے لگا میں اس لاوے سے دور ہٹنے لگی آگ کا سمندر میرے پیچھے آرہا تھا میں نے ہر چند کہ اپنی رفتار تیز کردی تھی مگر لاوے کی تپش میں محسوس کر رہی تھی یہ تپش کسی کی ناکام حسرتوں کی طرح میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی مجھے ایسی تپش سے ہمیشہ سابقہ رہا ہے، میں اکثر جھلستی رہی ہوں، میں نے اچانک اپنے آپ کو لاوے کی نذر کردیا میں بھی گرم لاوا بن کر بہنے لگی کہ زندگی کو یہ بتا سکوں کہ میں جل بھی سکتی ہوں۔۔۔۔ اور جلا بھی سکتی ہوں ۔۔!!

رشتہ

میں نے جب بھی رشتوں کے بارے میں غور کیا مجھے سر رشتہ کمزور نظر آیا کہیں نہ کہیں رشتوں کے تناور درخت بادِ مخالف سے شاخِ گل کی طرح

پھلتے محسوس ہوتے، کبھی یہ رشتوں کے شہتیر مجھے تتلیوں کی طرح ہوا میں اڑتے ہوئے دکھائی دیتے، اس لئے میں صرف "نظامِ دہر" کی خاطر رشتوں کو تسلیم کرتی ہوں ورنہ اپنے اکیلے پن کا احساس تو کسی سے بھی رشتہ جوڑنا دکھائی نہیں دیتا، کبھی کبھی یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ میرا ہر ایک سے رشتہ ہے لیکن بس! ایسے نام رشتہ جیسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے نام نہیں دیا جا سکتا" رشتوں کو مخاطب کرنے میں پل نہیں لگتا لیکن طریقِ عمل سے ثابت کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے رشتہ بنانے اور بن جانے میں یہی فرق ہوتا ہے رشتے کئی خانوں میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن احساس محبت کبھی تقسیم نہیں ہوتا رشتوں میں احترام نہ ہو، جذبۂ ایثار نہ ہو تو رشتوں کا مطلب ہی کچھ نہیں رہتا جب کہ محبت میں بڑی بڑی قربانیاں دی جاتی ہیں، رشتے قتل کئے جاتے ہیں، محبت مر نہیں سکتی، رشتے توڑ دیئے جاتے ہیں محبت چھوڑی نہیں جاتی، رشتے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ محبت محسوس کی جاتی ہے، رشتوں کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ محبت خود ثابت ہو جاتی ہے رشتوں کی پہچان کے لئے نام و نسب بھی ضروری نہیں۔ محبت میں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود نظامِ دہر کے لئے رشتے ضروری ہیں۔

اور محبت انسان کی بقا کے لئے ۔۔۔۔۔۔۔

کاش ایسا ہو سکے

میری زندگی ہمیشہ صلیبوں کے ساتھ گذری ہے ہر پل میخیں ٹھوکے جانے کا ڈر، ہر لمحہ صلیبوں کے کھڑے کئے جانے کا خوف رکھتے ہوئے بھی میں نے وہی راستہ اپنایا جہاں میری صلیب میرے ساتھ تھی اگر پاؤں میں زنجیریں نہ بھی ہوتیں تب بھی یہ صلیب کو اٹھائے ہوئے میرے قدم راہِ فرار اختیار نہ کر پاتے تپتے ہوئے صحرا میں میں نے کوئی آواز نہیں سنی، کوئی سرگوشی بھی نہیں، اس صحرا میں میں نے جب اپنے آپ کو پکارا تو میری آواز بھی مجھ تک لوٹ کر نہیں آئی میں نے چاہا کہ چلتے چلتے پاؤں کی زنجیریں ہی کم سے کم بج اٹھیں مجھے اپنے وجود کا احساس تو ہو مگر ریت کے تودوں نے زنجیروں کو بجنے کی اجازت نہیں دی، سناٹا ہی سناٹا ہے ـــ کسقدر سناٹا ـــ

آنکھیں ابھی دیکھنے سے قاصر نہیں ہوئیں آنکھوں نے صلیبوں کو دیکھا ہے کانپتے ہاتھوں نے صلیبوں کو محسوس کیا ہے کبھی کبھی پاگل سے صحرائی بگولوں نے مجھے جھنجھوڑنے کی کوشش کی مگر اس ذرا سی جنبش سے بھی کہیں اپنے پن کا احساس نہ ہو سکا سمت کا تعین کئے بغیر آگے چلنا ممکن نہیں، مجھے کئی بار پیچھے مڑنا پڑا کبھی دائیں کبھی بائیں مگر جہاں میرے قدم تھے وہ وہیں رکے رکے سے رہنے کے باوجود۔ ایسے حالات میں ڈگمگاتے قدموں کے لئے صلیب کا سہارا بہت بڑی بات ہے زندگی

کو ختم کرنے والی صلیب میرے لئے سہارا بنی ہے پاؤں میں پڑی زنجیریں مجھے ان بگولوں سے دور جانے ہی نہیں دیتیں جو مجھے ریت میں دفن کرنے پر تُلے ہیں دھوپ کی تمازت میرے ہونٹوں پر جم گئی ہے، سورج کا عکس میری آنکھوں میں اتر آیا ہے، ماحول کی تپش سے زندگی لمحہ لمحہ پگھلنے لگی ہے کاش! ذرا دیر کے لئے میرے منہ سے کوئی چیخ ہی نکل جائے جس سے سناٹے کے اس مضبوط قلعے میں شگاف پڑ جائے کاش! میرے پاؤں کی زنجیریں چھنچھنا اٹھیں، پل بھر کے لئے مجھے کسی آواز کا احساس تو ہو، مجھے میرے وجود کا یقین تو ہو تاکہ میری گرفت اپنی صلیب پر اور بھی مضبوط ہو سکے ۔۔۔ کاش ۔۔۔۔ ایسا ہو سکے!!!

---

5 / مارچ 92ء

بوگن ولا کی بیلیں تو بس زلیخا کی طرح ہوتی ہیں، ہمیشہ پُر بہار رہتی ہیں رنگ بھی نکھرے ہوئے پتے بھی شاداب، گرما کے موسم میں جب کہ زیادہ تر درختوں پر خزاں چھائی ہوئی بوگن ولا کی بیلیں فضا میں رنگ بکھرے بڑی متانت سے موسم کی دھوپ چھاؤں سے گلے مل رہی ہیں۔

میرے سامنے کئی خزاں رسیدہ درخت موسم کی بے وفائی کا شکوہ کرتے

ہوئے نظر آرہے ہیں ان کی سوکھی ہوئی شاخیں آسمان کی طرف بانہیں پھیلائے ابھی تک بہار کی منتظر ہیں ان کا کاسۂ گدائی پھیلا ہوا ہے اور ان سب کے درمیان ایک سر سبز و شاداب چھوٹا سا درخت مسکرا رہا ہے، اترا رہا ہے کہ وہ موسم بہار کا سب سے محبوب درخت ہے وہ بہار کے تئے پیرہن سے نکھرا نکھرا ہے اسے بہت ناز ہے، اتنے خزاں رسیدہ درختوں میں اس کی مسکراہٹ اور بھی نمایاں ہوگئی ہے وہیں ذرا فاصلے پر ایک کھجور کا چھوٹا سا درخت زلفِ پریشان کی طرح نوکیلی ٹہنیاں لئے حیران سائیہ نظارہ دیکھ رہا ہے آس پاس دو چار چٹانیں اپنی پیشانی نوکیلی زمین کی تہہ سے باہر نکالے جھانک رہی ہیں ان پر کبھی کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا وہ ہمیشہ ایک طرح رہتی ہیں خزاں و بہار کا مطلب انھیں نہیں معلوم، اپنے قریب سانپوں کے "ھُدُ" سے کیڑے مکوڑے، نکل کر ان چٹانوں پر سے ہوتے ہوئے درختوں کی شاخوں پر چڑھ جاتے ہیں ۔۔

یہی روز و شب کا عالم ہے درختوں کے نیچے خشک پتے بکھرے ہوئے ہیں جن پر پاؤں رکھتے ہی کھڑک جاتے ہیں اب کی بار میں موسمِ خزاں میں یہاں آئی ہوں شاید کبھی موسمِ بہار میں پھر میرا یہاں آنا ہو جائے تو دیکھوں گی یہی کاسۂ گدائی لئے ہوئے درخت پھولوں کے تاج پہنے فصلِ گل کے شانوں پر مسکرا رہے ہوں گے نیچے سوکھے پتوں کی جگہ نرم، گیلی سی مٹی ہوگی مجھے اپنے پیروں تلے مسندِ بہار کا احساس ہوگا میں ننگے پاؤں اس فرش پر چلوں گی، میں فصلِ گل کا ایک اک لمحہ اپنے اندر جذب کرلوں گی سوکھی ہوئی شاخوں کی شادابی دیکھ کر میں بھی مسکرا دوں گی جیسے کہ بہار کا اک لمحہ ــــــــــــ؟

"تاروں کی بات"

* لوگ کہتے ہیں کہ تارے آسمان سے ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ آسمان سے تارے گر کر ٹوٹ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہے نا۔۔۔۔!



"سوال در سوال"

* لوگ بہتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر آنسوؤں کا سبب پوچھتے ہیں۔

— یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ خواب بھی کبھی پگھل جاتے ہیں۔۔۔۔۔



"ادھورا لمحہ"

* رات کی آخری ساعتوں اور صبح کی ابتدائی گھڑیوں کے درمیان جو وقت ہوتا ہے اُس کا نام کیا ہے؟ یہ سوال میں اکثر اپنے آپ سے کرتی ہوں۔۔۔۔! اب میں نے اس "وقت" کا نام "ادھورا لمحہ" رکھ دیا ہے، ٹھیک ہے نا!!!



"آئینہ"

* مجھے آئینہ بالکل پسند نہیں، اور یہ اس لئے کہ آئینہ مجھ پر سبقت لے جانا چاہتا ہے ـــ دیکھئے نا! یہ مجھ سے بھی سچ کہتا ہے اور مجھ سے زیادہ سچ کہتا ہے، جیسے اس نے کبھی جھوٹ کہا ہی نہ ہو .... ہونہہ ....!



"اُجالوں کی خیرات"

* میں ہر شام ڈوبتے سورج کا منظر دیکھتے ہوئے سوچتی ہوں کہ یہ نقابِ شب منہ پر ڈالے ہوئے سورج اُجالے لیئے آخر جاتا کہاں ہے؟ کون ہے وہ، جس کے پاس اتنے اُجالے ہیں، اتنے اُجالے ہیں کہ کائنات کا دامن ہمیشہ اُجالوں کی خیرات سے بھرا رہتا ہے۔ اسے کبھی دامنِ طلب آگے بڑھانا ہی نہیں پڑتا ... ؟



"خوشبو"

* پھول تازہ ہوں تو خوشبو پھیل جاتی ہے، لیکن جب پھول سوکھ جاتے ہیں تو خوشبو سوکھے پھولوں کی پتیوں میں سمٹ جاتی ہے اور سوکھے ہوئے پھولوں کی مخصوص

خوشبو ماضی کے مہکتے لمحوں کو اپنے اندر قید کرلیتی ہے، سوکھے ہوئے پھول ماضی کی کتابوں کو مہکا دیتے ہیں اور تازہ پھول حال کے اُس منظر کو معطر کرتے ہیں جہاں ہم موجود ہوتے ہیں، اسی لئے پھولوں کے رنگ، اِتنے اہم نہیں ہوتے جتنی ان کی خوشبو۔



"زخمی جبیں"

* میں اکثر صبح "جبینِ فلک" پر اُبھر آنے والے اُس زخم کو بغور دیکھتی ہوں جسے لوگ "سورج" کہتے ہیں، آسمان کی زخمی پیشانی دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس کا زخم کتنا گہرا ہے کہ سارے ماحول میں اس کی جلن محسوس ہوتی ہے۔ ہم اس کی تپش سے عرق، عرق ہوجاتے ہیں، ہم آسمان سے بے رخی کا شکوہ کرتے وقت اگر اس کا زخم بھی دیکھ لیں تو......



"کوشش جاری ہے"

* میرے آس پاس کئی راستے بکھرے ہوئے ہیں، میں اِن راستوں کو سمیٹ کر منزل بنانا چاہتی ہوں۔ میں کب سے اس کوشش میں ہوں، کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں کامیاب ہونے ہی والی ہوں، یہ بکھرے ہوئے راستے سمٹ کر منزل بن ہی جائیں گے مگر... مگر ہمیشہ ایک نہ ایک راستہ میری دسترس سے باہر ہی رہ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ناکام ہوں، ہرگز نہیں، میری کوشش جاری ہے مسلسل جاری ہے....

●

"بلاعنوان"

▪ دو چار شیشے پاؤں میں چبھ جائیں تو پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں مگر دل کی رگیں پھر بھی نہیں کٹتیں، ذرا بھی نہیں کٹتیں......
دل کی رگیں تو حالات کے نشتر سے ہی کٹتی ہیں، ہے نا!



▪ ہم بچتے ضرور ہیں لیکن اک خوف سا ہم پر طاری رہتا ہے کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے، کسی واردات کے قدم ہماری طرف نہ بڑھ آئیں، ہم کسی ناخوشگوار واقعہ کی گرفت میں نہ آ جائیں.....



▪ دنیا میں سب سے اچھا سفر خیالوں کا سفر ہے، جو کائنات سے آگے جا کر بھی ہم واپس آ جاتے ہیں، نہ دشواریٔ سفر، نہ زادِ راہ، نہ ہمسفر، نہ راہ نما، ہر قید سے آزاد...... شرطِ سفر کچھ بھی نہیں.....!



- "خوشیوں کے لبریز ساغر پینے کے لئے نہیں، پلانے کے لئے ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"



- "قلم ایک ایسا ہتھیار ہے جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔"



- خوش اخلاق معالج کی تسلی آمیز مسکراہٹ زخموں کو مندمل کرنے میں مرہم سے زیادہ اثر کرتی ہے۔



- پتوں پر پانی کے قطرے جب ٹھہر نہیں سکتے تو پھر آکر گرتے کیوں ہیں؟



- ناتراشیدہ پتھروں کے دام کیوں نہیں لگتے ؟ جبکہ ترشے ہوئے پتھر اپنی قیمت رکھتے ہیں ـــ !



- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بہاریں برستی ہیں یا اُگتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

▪ دل جب پریشان ہوتا ہے، وسوسے ہمیں گھیر لیتے ہیں، پھر ہمارے وجود کے اندر کہیں دور سے ایک آواز سنائی دیتی ہے "سب ٹھیک ہو جائے گا" اور پھر یہ تسلّی آمیز گفتگو کہیں کھو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اضطراب اور سکون خود ہمارے اندر ہوتا ہے ـــــ!



▪ کبھی خیرات مانگو تو "اعزاز" مل جاتا ہے، کبھی اپنا حق بھی ہم سے کوئی چھین لیتا ہے، معلوم نہیں ایسے "لین دین" کا نظام کس طرح دُنیا میں قائم ہوا...؟ مگر میرا یہ ایقان ہے کہ پانے سے کھونا بہتر ہے ......!



▪ بکھرے ہوئے موتی تو سب ہی سمیٹ لیتے ہیں، ٹوٹے ہوئے دل کے اُن ٹکڑوں کو سمیٹنا زیادہ بہتر ہے جو کسی انسان کے اندر بکھرے ہوتے ہیں۔



▪ دکھائی دیتے والے آنسو اور سُنائی دینے والی آہوں سے زیادہ اثر خاموشی میں ہوتا ہے..........!





○ زیادہ دیر اندھیرے میں رہنے سے اندھیرے کی عادت ہو جاتی ہے، اور روشنی برداشت نہیں ہوتی، آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، اِس تیز روشنی سے اندھیرے کا وہ نقاب ہی بہتر ہے جس میں ہم اپنی آنکھیں کھلی تو رکھ سکتے ہیں، ہے نا!



○ نہ ہم طلوعِ آفتاب پر فتح پا سکتے ہیں اور نہ غروبِ آفتاب پر ہمارا قابو ہے، ہم گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چراغ جلا کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم روشنی پر غالب ہیں . . . . ؟



○ لوگ پھولوں کی کانٹوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں، اُس نم اور مہکتی مٹی کا ذکر کرنا ہی بھول جاتے ہیں جو شادابیِ چمن کا سبب ہوتی ہے . . . .



○ زندگی اُس مکان کی دہلیز کی طرح ہے جہاں میں "محافظ" کی طرح ٹھہری ہوئی ہوں، اِس لئے حادثے مجھ تک آ کر پلٹ جاتے ہیں، مکان کے

اندر نہیں جا سکتے۔



○ بادلوں میں اتنی طاقت تو ہوتی ہے کہ سمندر کی تہہ سے طوفان نکال لاتے ہیں، لیکن ہواؤں میں اتنا زور نہیں ہوتا کہ طوفانی لہروں کو ساکت کر سکیں۔



○ زندگی سے گھبرا کر موت کی تمنّا کرنے سے زندگی اور بھی طویل ہو جاتی ہے، زندگی کا مزاج بہت ضدی ہے اس لئے موت سے ہمیشہ لڑتی رہتی ہے!



○ موجیں، کناروں کے حصار میں رہ کر بھی مضطرب رہتی ہیں۔ موجیں، کناروں سے ملتی تو ہیں مگر ساتھ نہیں رہتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔



○ ہم جسمانی طور پر چاہے کہیں بھی ہوں لیکن "روح" وہیں ہوتی ہے جہاں ہم رہنا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔



○ آدمی خود شناس اُس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک اُس کے سامنے آئینہ نہ ہو۔"



○ یہ زندگی تو اک اندھیرے غار کی طرح ہے جہاں روشنی نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ٹھنڈک کا احساس بہت ہے .....



○ پرچھائیوں کا تعاقب کرنے سے بہتر ہے کہ غمگساروں کی تلاش کریں، جو کبھی مل بھی جاتے ہیں اور کبھی نہیں بھی ملتے .....!



○ بادلوں کی لکھی تحریریں موسم بن کر برستی ہیں اور زمین پر شادابیوں کے نقوش اُبھر آتے ہیں .....!



○ "بسترِ مرگ پر یہی سوچنا چاہیئے کہ ہم ابھی زندہ ہیں۔"



○ "اپنا عکس دوسروں کی آنکھوں میں زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔"



○

○ گذرا ہوا "کل" خواب اور "آج" ایک حقیقت اور آنے والا "کل" ایک فریب ہے . . . . .

○

○ "دینے والا ہاتھ اگر خالی ہو تو لینے والا دامن کیسے بھر سکتا ہے...؟"

○

○ "مانا کہ ہر موسم کا ماحول الگ ہوتا ہے پھر بھی سب موسم ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں . . . . . .

○

○ کئی عیدیں ایسی ہوتی ہیں جب دل کو ذرا خوشی نہیں ہوتی لیکن کچھ دن ایسے بھی ہوتے ہیں جب دل خوش ہوتا ہے 'بے حد خوش. . .

○

○ موتی سیپ میں اگر ہو تو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے' اگر موتی آنکھ میں ہو تو ڈاکٹر نکال پھینکتے ہیں' معلوم نہیں ایسا کیوں ہے ؟

○

○ پانی میں کنکریاں پھینک کر لہریں تو ضرور پیدا کی جاسکتی ہیں لیکن طوفان تو نہیں اُٹھائے جاسکتے نا ؟؟؟

○

○ یہ مہاجر پرندے کتنے وفادار ہوتے ہیں، اپنے کسی بھی ساتھی سے جُدا نہیں ہوتے، ساتھ ساتھ فضاؤں کا سفر کرتے رہتے ہیں . . .

○

○ "مٹی" اور پانی کی خوشبو اِس لئے مانوس لگتی ہے کہ وہ ہمارے اپنے وجود کی خوشبو ہوتی ہے ۔"

○

○ لوگ کہتے ہیں کہ کانٹوں پر چلنے کے بعد "فرشِ گُل" پر چلنے سے راحت کا احساس ہوتا ہے، مگر میرا تجربہ" یہ ہے کہ پاؤں میں کانٹے چبھنے کے بعد پاؤں پھولوں پر بھی رکھنے کے قابل نہیں رہتے۔

